تبصراتِ کتب

رضوان اللہ

تبصراتِ کتب

رضوان اللہ

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS

© جملہ حقوق بہ حقِ مصنف محفوظ

کتاب کا نام	:	تبصراتِ کتب
مصنف کا نام	:	رضوان اللہ
اشاعت	:	2022ء
صفحات	:	240
قیمت	:	-/400روپے
کمپوزنگ	:	خالد فیصل
ناشر	:	رضوان اللہ

D-178، ابوالفضل انکلیو–I، جامعہ نگر، نئی دہلی–110025
Email: ruilmi@rediffmail.com
Mobile: 9971283786

زیر اہتمام : **اپلائڈ بکس** Applied Books
1739/10 (Basement), Pataudi House, Darya Ganj
New Delhi - 110002 Tel. 011-23266347
Mobile: 9953630788 / 9899506816
E-mail: appliedbooks@gmail.com

ISBN 978-93-90579-15-0

ملنے کے پتے:

(۱) اردو بک ریویو، 1739/104، فرسٹ فلور، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002 فون:011-23266347

(۲) رضوان اللہ، D-178، ابوالفضل انکلیو–I، جامعہ نگر، نئی دہلی–110025

(۳) ڈاکٹر زہرہ خاتون، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی–110025

TABSERAT-E-KUTUB
By: Rizwanullah
Ist Edition: 2022 Pages: 240 Price: Rs. 400/-
Printed at: Images & Impressions, New Delhi-2

(۱)

گفتا کہ تبصراتِ کتب ہم کتاب ہست
گفتم ولے ایں ناقدِ خوب و خراب ہست
گفتا کہ ایں کتاب مثالِ دگر کتب
گفتم ولے میانِ کتب انتخاب ہست

(۲)

گفتا کہ ایں دکانِ کتاب و قلم بس است
گفتم کسے نداد دکانِ چنیں زدست
گفتا دکان خالی زِ فکر و سخن چہ سود
گفتم کہ ایں دکان زِ مردانِ خود پرست

رضوان اللہ

انتساب

ان ادب نواز حضرات کے نام
جن کے رشحات قلم سے میری
تصنیفات کی قدر افزائی ہوئی۔

رضوان اللہ

فہرست

	عنوانات	صفحہ نمبر
●	دیباچہ	8

حصہ اول

1	اوراقِ ہستی (اردو بک ریویو)	11
2	خودنوشت اوراقِ ہستی (اردو دنیا)	22
3	اوراقِ ہستی: ایک مطالعہ (ڈاکٹر مغیث احمد)	26
4	کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخی مگر حزنیہ داستان (سہیل انجم)	37
5	ایک فریادی دستاویز (سعید سہروردی)	43
6	کلکتہ کی اردو صحافت (اشہر ہاشمی)	48
7	کلکتہ کی اردو صحافت اور میں (خاور حسن)	51
8	تعارف: اوراقِ مصور (پروفیسر شمیم حنفی)	53
9	مقدمہ (پروفیسر شمیم حنفی)	56

10	اوراقِ مصور– بے ادبیات	59
11	تبصرہ: ہمارے گاؤں ہمارے لوگ (ڈاکٹر زہرہ فاروقی)	66
12	Author's Version	68
13	''عکسِ خیال'' یا درونِ ذات کے کرب کا اظہاریہ (سہیل انجم)	75
14	مصنف کا اپنا ترجمہ (ف.س. اعجاز)	84
15	عکسِ خیال (وصیل خاں)	86
16	مکتوبات (شافع قدوائی/علقمہ شبلی)	90

حصہ دوم

1	قومی آواز	97
2	کتب صحافت کی بازدید	106
	● اردو صحافت کا استغاثہ	108
	● اردو اخبارات مغربی دنیا میں	110
	● اردو ماس میڈیا	112
	● ریڈیو اور ٹی وی میں ترسیل کی زبان	113
	● ابلاغیات	113
	● اردو صحافت ترجمہ و ادارت	114
	● حیدرآباد میں اردو صحافت	115
	● بازیافت	116
	● میڈیا روپ اور بہروپ	116
	● مغربی میڈیا اور اسلام	117

	● میڈیا، اردو اور جدید رجحانات	118
	● اردو صحافت کا سفر	121
3	اکیسویں صدی میں اردو صحافت	125
4	خواتین کی خودنوشت سوانح عمری	134
5	اسپین میگزین	142
6	حجاب اسلامی	146
7	فیملی کونسلنگ (حجاب اسلامی کا خصوصی شمارہ)	152
8	بازدید حرم	156
9	دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات	160
10	اودھ کے فارسی گوشعراء	169
11	نقش ثانی	175
12	کشف المحجوب (نصاب تصوف)	177
13	ابتدائی اردو گرامر	186
14	مولانا اظہر غوری کی تصنیفات	188
15	سخنورانِ اعظم گڑھ	197
16	صدیقی سسٹرس کی کہانیاں اور پس منظر	218
17	یادوں کا سفر (خودنوشت سوانح حیات)	226
18	تاریخ بنگالہ (بزبان فارسی)	232

دیباچہ

میری یہ تصنیف بعنوان ''تبصراتِ کتب'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ادب نواز حضرات کی وہ تقریظیں اور تبصرے ہیں جو انھوں نے میری مختلف تصنیفات پر رقم کیے، دوسرے حصے میں وہ تبصرے ہیں جو دوستوں کی عطا کی ہوئی تصنیفات پر میں نے لکھے ہیں۔ دراصل میں دو طرح کے قرضوں کا بوجھ محسوس کر رہا تھا، ایک ان کا جنھوں نے میری تصنیفات کو درخورِ اعتنا سمجھا، دوسرے ان کا جنھوں نے اپنی تصنیفات مجھے عطا کیں۔ موجودہ تصنیف کے ذریعہ ان دونوں طرح کے قرضوں کی اپنی بساط بھر ادائیگی مناسب معلوم ہوئی، سو ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش اپنی ایسی کیفیت میں کر رہا ہوں کہ جب بقول غالبؔ

''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''

چونکہ دوسرے حصے میں مضامین کی تعداد زیادہ ہے اور تنوع بھی ہے اس لیے ان کی ترتیب میں کوئی لحاظ رکھنا ضروری ہوا چنانچہ پہلے صحافت سے متعلق مضامین کو رکھا گیا ہے ان کے بعد دیگر مضامین ہیں۔

سپاس گزار

رضوان اللہ

حصہ اول

بسم الله الرحمن الرحيم

اوراقِ ہستی

ایک چشم کشا خودنوشت سوانح حیات

مصنف/ ناشر	:	رضوان اللہ
صفحات	:	488
قیمت	:	800روپلے
سن اشاعت	:	2020
رابطہ	:	D-178،ابوالفضل انکلیو–I، جامعہ نگر، نئی دہلی، 110025 موبائل:9971283786
مبصر	:	محمد عارف اقبال

خودنوشت سوانح عمری یقینی طور پر اپنے عہد کی تاریخ کا حصہ ہوتی ہے۔ چند بہترین اور مستند خودنوشت سوانح میں سابق بیوروکریٹ، ادیب اور افسانہ نگار قدرت اللہ شہاب (مرحوم) کے 'شہاب نامہ' کو میرے نزدیک اولیت حاصل ہے۔ تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل اس سوانح کے مطالعے کے بعد میرا احساس ہے کہ اگر 'شہاب نامہ' نہیں لکھا جاتا تو

برصغیر کی تاریخ کے چند اہم حقائق اب بھی پردۂ اخفا میں ہوتے۔

ممتاز و معروف صحافی رضوان اللہ فاروقی کی زیرِ نظر کتاب 'اوراقِ ہستی' کا مطالعہ بھی 'آزاد ہندوستان' کے بعض تاریخی حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ خواہ ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں۔ رضوان اللہ صاحب (پیدائش 15/جولائی 1931) جن کو قصداً میں فاروقی لکھوں گا کہ اسکول میں داخلہ کے وقت سہواً ان کے نام کے ساتھ 'فاروقی' نہیں لکھا گیا جس کے سبب وہ زندگی بھر اپنا نام صرف 'رضوان اللہ' بتاتے رہے اور اسی نام سے ان کی کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ یہ کس قدر صبر آزما آزمائش ہے کہ جب ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنے بھائی کو پروفیسر فیضان اللہ فاروقی لکھا لیکن اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ انھوں نے 'فاروقی' لکھنے سے گریز کیا۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ فارسی میں پروفسر ہیں۔ 2019 کے اواخر میں ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ سے 90 سالہ رضوان اللہ صاحب ایک طرح سے قیدِ تنہائی کے اسیر ہوگئے۔ دہلی میں واقع موجودہ امریکن سینٹر جو کبھی USIS کے نام سے جانا جاتا تھا، اس ادارے سے رضوان اللہ فاروقی تقریباً اٹھارہ سال وابستہ رہے، لیکن یہ وابستگی جتنی سحر انگیز اور پُرکشش معلوم ہوتی ہے، اس 'آپ بیتی' کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے اس ذہین صحافی کی زندگی ہر پل اور ہر لمحہ کتنی دشوار گزار جدوجہد میں گزری ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے دیباچہ میں اپنی علمی، ادبی و صحافتی مصروفیات کی اسناد کے طور پر اپنی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں چار کتابوں کا انگریزی سے اردو میں اور چار کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ انگریزی رسالہ 'ملی گزٹ' نکلا تو اس کے کالم نگار کے طور پر رضوان اللہ (فاروقی) نے تقریباً ایک سو مضامین لکھے۔ اسی طرح امریکی سفارت خانے کا مایہ ناز اردو مجلّہ اسپین (SPAN) جاری ہوا تو اس کے لیے انھوں نے کوئی چار برسوں میں 272 مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پھر اس کے بعد ان کی کتاب 'بے ادبیات' (2000)، 'اوراقِ

مصور'(2002)، 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'(2006)، 'متاعِ سحر'(2008)، 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'(2011)، My Reflection (2013) شائع ہوئیں۔ ان کتابوں سے بہت قبل 1975 میں رضوان اللہ صاحب نے کلکتہ کو الوداع کہنے سے قبل Urdu Sefltought لکھا تھا، جسے داس گپتا پرکاشن نے شائع کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بہت قبل 1962 میں انھوں نے "Janson Primer" اور اس کے بعد "Janson Reader" نامی دو کتابیں لکھی تھیں، جسے دارالاشاعت اسلامیہ، کلکتہ نے شائع کیا تھا، جس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں۔

ابھی تک یہاں رضوان اللہ (فاروقی) کے چند اچیومنٹس کا تذکرہ ہی کیا گیا ہے، لیکن اس خودنوشت آپ بیتی سے انداہ ہوتا ہے کہ 'آزاد ہندوستان' میں ایک ٹین ایجر نوجوان کئی طرح کی محرومیوں کے ساتھ جب اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو کن دشواریوں سے نبردآزما ہوتا ہے۔ اس کے سامنے نہ صرف اپنی تعلیم کا مسئلہ ہے بلکہ زندہ رہنے کے لیے روزگار کا سنگین مسئلہ بھی ہے۔ اپنے آبائی گاؤں سمبھی (اعظم گڑھ) سے دور کانپور، بنارس، جونپور کی خاک چھانتے ہوئے کلکتہ کا سفر اور وہاں کی آزمائشیں نہ صرف جان لیوا ثابت ہوئیں بلکہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود کو اللہ کے کرم سے گرنے سے محفوظ رکھنا عام ذہن وشعور رکھنے والے انسان کے بس میں نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی نصرت اسے حاصل ہوتی ہے جو پختہ کردار کا مالک ہو اور اللہ رب العزت پر کامل یقین رکھتا ہو۔

'اوراقِ ہستی' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ایک عرصے کے بعد ایک اوریجنل علمی وتاریخی کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ مصنف کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ انھوں نے اس پیرانہ سالی میں ہمت وحوصلہ کے ساتھ دنیائے علم وادب کو ان تاریخی حالات وواقعات سے روشناس کرایا کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ایک معتبر قلم کار کی علمی کاوش سے ہم محروم ہی رہتے۔ ہندوستان میں 'اردو صحافت' کی خدمات کے چرچے جنگ آزادی کے

حوالے سے بہت ہوتے ہیں اور اس کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے ہم رطب اللسان ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے۔لیکن آزاد ہندوستان میں 'اردو صحافت' کے زوال کی چشم دید داستان سنانے والے رضوان اللہ (فاروقی) شاید آخری شخص ہیں۔ کتاب کی زبان شستہ اور اندازِ پیش کش پُرکشش ہے۔اپنی اس ضخیم آپ بیتی کو انھوں نے دیباچہ کے بعد صرف چار اوراق یا چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔

'پہلا ورق' (صفحہ 19 تا 151) خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت اور تلاش معاش کے ابتدائی مرحلے کو اجاگر کرتا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ یہی عرصہ گزشتہ صدی میں برصغیر کا انتہائی انقلاب انگیز دور بھی تھا۔ اپنے نانیہالی گاؤں سمبھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''کوئی چار پانچ گھرانے ایسے تھے جنھیں بالادستی حاصل تھی انہیں میں سے ایک بلکہ سب سے ممتاز گھرانا میرے نانا نانی کا تھا۔'' (صفحہ 37) ''انسانی قد و قامت کے اعتبار سے مسلمانوں کا طبقہ اشراف اور چھتریوں میں کافی مماثلتیں تھیں۔'' آگے لکھتے ہیں: ''مسلم آبادی کے قلب میں ایک اونچا چوکور چبوترہ تھا، جس کی لیپ پوت محرم کے قریب آتے ہی شروع ہوجاتی اور اس پر تعزیہ رکھا جاتا۔ مندر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی مکتب، مدرسہ یا اسکول بھی نہیں تھا۔ قرآن اور ابتدائی اردو گھروں میں پڑھائی جاتی۔ ہمارے گھرانے میں ہماری ماں اس باب میں سب سے آگے تھیں، محلے کی لڑکیوں کو اور نہ معلوم کتنے لڑکوں کو بھی پڑھا کر فارغ کردیا......'' (صفحہ 36-37)

مصنف کا آبائی گاؤں یعنی دادیہال کوئریا پار ہے۔ سمبھی کی طرح یہ دور افتادہ گاؤں ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل گھوسی میں واقع تھا اب نوتشکیل ضلع مئو میں شامل کردیا گیا ہے۔ (صفحہ 47) مصنف لکھتے ہیں: ''آزادی ملتے ہی سب سے پہلے جب یوپی میں زمینداری کے خاتمے کا قانون پاس ہوا تو زمینوں اور مکانوں پر ہر قابض اس کا قانونی مالک بن بیٹھا اور زمیندار اپنی ملکیت سے محروم ہوگیا۔ آزاد ہندوستان میں یہ پہلا امتیاز تھا جو

قانونی طور پر نافذ کیا گیا۔ زمین داری دیہی علاقوں میں راتوں رات ختم کردی گئی جبکہ شہری علاقوں میں زمینوں اور جائدادوں کو تنسیخ زمینداری کے اس قانون سے بری رکھا گیا۔'' (صفحہ 51)۔ مصنف کی رشتہ داری آج کل (اردو) کے سابق ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی (مرحوم) اور معروف نقاد و ادیب شمس الرحمٰن فاروقی (مرحوم) سے بھی تھی۔ مصنف کے والد مولوی سبحان اللہ (مرحوم) کے بڑے چچا زاد بھائی مولوی محمد اصغر کے سب سے چھوٹے بیٹے خلیل الرحمٰن فاروقی (ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) تھے۔ انہی کے سات بیٹوں میں شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ مولوی محمد اصغر گورکھپور گورنمنٹ نارمل اسکول میں ٹیچر تھے۔ انھوں فراق گورکھپوری کو بچپن میں اردو اور فارسی پڑھائی تھی۔ منشی پریم چند اور ان کے ہم عصروں میں تھے۔ (صفحہ 57-58)۔ مصنف کے بڑے دادا مولوی محمد عمر کی طبابت کا شہرہ دور دور تک تھا۔ صوبہ بہار کے شہر سمستی پور میں عرصہ دراز تک ان کا قیام رہا۔ وہ دربھنگہ مہاراج کے بھی خاص طبیب تھے۔

مصنف جولائی 1937 میں اپنے ماموں جان کے ساتھ کانپور پہنچے تھے۔ وہیں ان کا داخلہ فیض عام اسکول میں ہوا۔ اس اسکول میں فرسٹ ایڈ (First Aid) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ (صفحہ 83) وہیں ان کی ملاقات نشوؔر واحدی صاحب (و: جنوری 1983) سے ہوئی جو ایک مسجد میں پیش امام تھے۔ (صفحہ 85) بعد میں نشوؔر واحدی درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ بہترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مصنف نے 1939ء میں کانپور کے فساد کا مشاہدہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''کانپور میں فسادات عام طور سے مول گنج کے چوراہے سے شروع ہوتے، جو ہندو آبادی اور مسلم آبادی کا نقطۂ اتصال یا خطِ تقسیم تھا۔ 1939 کے بعد ہر سال ہی فسادات ہوتے۔'' (صفحہ 91)۔ مصنف نے کانپور میں برہمنوں کے کالج 'کانیہ کبج' میں بھی تعلیم حاصل کی۔ وہاں مسلمان طلبا معدود چند تھے لیکن اردو اور فارسی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ فارسی کے کلاس میں پندرہ

سولہ طلبا تھے اور اردو کے کلاس میں تقریباً چالیس۔ (صفحہ 102) مصنف کی زندگی کی ستم ظریفی ہے کہ ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن سے پاس کرتے ہی تلاش معاش کے لیے جون 1946 میں وہ عازمِ کلکتہ ہوئے۔اس زمانے میں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور حسین شہید سہروردی اس صوبے کے وزیراعظم تھے۔(صفحہ 110)

مصنف 1946 میں کلکتہ پہنچے تھے اور پھل منڈی میں کام کیا تھا، لیکن ساتھ ہی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ایک شفیق اور مہربان کی مدد سے ایک ایوننگ کالج میں ان کا داخلہ بھی ہوگیا تھا۔مصنف لکھتے ہیں کہ رمضان کی 18 تاریخ کو اگست کی 16 تاریخ تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن پلان کے تحت جلوسوں کا خاص اہتمام کیا تھا۔ پھر کیا تھا ایک فساد کی صورت پیدا ہوگئی اور جمعہ کی نماز کے وقت آگ کے شعلوں نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ 'عصر جدید' کے ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی اپنے دفتر کی سیڑھیوں پر ہی نامعلوم گولی کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگئے۔ (صفحہ 114) کوئی ہفتہ بھر سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی کیفیت ایسی نہ تھی کہ کوئی انہیں اٹھاتا۔ چنانچہ فوجیوں کی نگرانی میں مردہ جانور ڈھونے والی گاڑیاں لائی گئیں اور کرین سے اٹھا اٹھا کر لاشیں ان میں لادی گئیں، پھر ان کا جو بھی حشر ہوا ہو۔(صفحہ 119)۔

تبصرہ طویل ہوگیا ہے لیکن 15 سالہ رضوان اللہ کی چشم دید گواہی سے فسادات کے ہولناک مناظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ٹین ایجر کے قلب و ذہن کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔اسی باب میں قیام بنارس، ریلوے کی ملازمت اور دیگر دلچسپ واقعات بھی ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب یا 'دوسرا ورق' (153 تا 284 صفحات) مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے جب وہ اردو صحافت سے منسلک ہوئے۔مصنف کے بقول ''اردو صحافت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور اسے ڈھوئے پھر رہا تھا۔'' مصنف نے اردو صحافت کو سرکاری ملازمتوں میں تاک جھانک کے بعد ہی اختیار کیا تھا جو بعد میں ان کی

مجبوری بن گیا۔ اس باب میں صحافت کی تعریف اور ہندوستانی صحافت اور خود پر بیتی روداد کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے آزاد ہندوستان کے اردو اخبارات سے جو حسنِ ظن رکھا تھا وہ ایک ہی پل میں زمین بوس ہوگیا تھا۔ وہ 1951 میں پیشہ اردو صحافت سے وابستہ ہوئے اور 3 جولائی 1952 کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیے گئے۔ شادی کے آٹھ دس روز بعد پھر کلکتہ آگئے۔ (صفحہ 175) وہ کلکتہ کے معروف اخبار 'عصرِ جدید' سے بحیثیت مترجم وابستہ ہوئے۔ اس کے مالک خان بہادر صاحب تھے جن کی عدالت میں ملازم کے Hiring اور Firing کا معاملہ لمحوں میں طے ہوتا تھا۔ مصنف نے 'آبشار' کلکتہ کے ایڈیٹر کی ایک عبارت یوں نقل کی ہے:

''اس زمانے میں اخبار میں کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ خستہ اور قابلِ رحم حالت مترجمین کی ہوا کرتی تھی۔ وہ مترجم بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا تھا جسے کبھی کبھی اپنی سرتوڑ خدمات کے معاوضہ میں کچھ رقم مل جایا کرتی ورنہ عموماً انھیں زیادہ تر مفت کام کرنا پڑتا تھا۔'' (صفحہ 160)

'آبشار' کے ایڈیٹر ابراہیم ہوش کے مضامین کا یہ سلسلہ 1983 میں روزنامہ 'اقرا' کلکتہ میں شائع ہوا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ 'عصرِ جدید' کے مالک خان بہادر شیخ محمد جان صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے لیکن ان کی 'عدالتِ عالیہ' لمحوں میں بڑی سفاکانہ فیصلہ کرتی تھی۔ مصنف اس اخبار سے اٹھارہ سال چپکے رہے لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ کبھی اس 'عدالت' میں ان کی پیشی نہیں ہوئی۔ مصنف نے ایک لمبی فہرست سے کچھ نام درج کیے ہیں جن کو اس 'عدالت' میں جھٹکا کیا گیا۔ ان میں یونس احمر، خلیل عباس صدیقی، اسرائیل احمد، ش مظفر پوری، ولی اللہ، محمد عثمانی، اختر ملیح آبادی، حامد محمود نیازی، بسنت کمار چٹرجی، محمود راہی، وہاب اشرفی، سید ظفیر الحسن، سید محمد مصطفیٰ صابری، فاتح فرخ، رئیس جعفری، ناظر الحسینی، جاوید نہال، شہزاد منظر، محمود ایوبی، اقبال کلکتوی، شہاب لکھنوی، راز عظیم، شفیع نشاط، نیاز

اعظمی، مطیع الرحمٰن، ادریس الحق، مشتاق احمد، سجاد نظر، بدر عالم نظامی وغیرہ شامل تھے۔ ان میں چند وہ اردو صحافی بھی تھے جو بعد میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان حضرات میں کئی ایسے بھی تھے جو ایک سے زیادہ 'عصر جدید' یا 'امروز' میں تقرر اور برطرفی کی لذتوں سے آشنا ہوئے۔ 'روزانہ ہند' اور 'آزاد ہند' اخبارات میں بھی ان کا تقرر ہو جاتا تھا لیکن مالکانہ اعتبار سے اردو صحافیوں کے ساتھ سبھوں کا رویہ کم و بیش ایک ہی جیسا تھا۔ انھوں نے اردو صحافت کے 'مالکانہ زوال' پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تاہم مصنف کا یہ روح فرسا بیان قابلِ توجہ ہے:

''......چنانچہ جب میں اپنی صحافتی زندگی کے ابتدائی دور کا تصور کرتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ حیران ہو کر سوچتا ہوں کہ مسلمان سرمایہ داروں نے اپنے ہونہار نوجوانوں کے ساتھ ایک ابتلا اور آزمائش کے دور میں جو سلوک روا رکھا کیا تاریخ میں کبھی کسی اور قوم کے صاحبِ ثروت طبقے نے ایسا کیا ہوگا! شاید نہیں!'' (صفحہ 159) شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم کا پوسٹ گریجویٹ کورس بھی کیا۔ جز وقتی طور پر یو ایس آئی ایس (امریکی انفارمیشن سروس) میں بھی کام شروع کر دیا۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جہاں اپنے چند صحافی دوستوں کے اخلاص اور مروت کا ذکر کیا ہے وہیں کلکتے میں جدوجہد سے پُر زندگی، قیام گاہ کی آزمائشیں اور 'عصر جدید' کی طرف سے زک پہنچانے کے پے در پے واقعات کی چشم کشا روداد بھی بیان کی ہے۔ مصنف چونکہ یو ایس آئی ایس سے بھی وابستہ تھے لہٰذا انھوں نے 'ڈپلومیٹک جرنلزم' لکھا ہے۔ بہت سی دشواریوں کے باوجود یہاں ان کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ یہی وابستگی بعد میں مصنف کے پیشہ ورانہ کریئر کا عروج ثابت ہوئی۔ پٹنہ میں امریکن لائبریری اور کلچرل سینٹر تھا جو یو ایس آئی ایس کلکتہ کے تحت کام کرتا تھا۔ وہاں غلام سرور صاحب (مالک و مدیر روزنامہ 'سنگم' اور سیاست داں) کے علاوہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ مظہر امام صاحب سے مصنف کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔

(صفحہ 243) عصرجدید میں کام کے دوران میں اگرچہ 'آزاد ہند' کے مدیر و مالک احمد سعید ملیح آبادی نے کئی بار 'آزاد ہند' سے منسلک ہونے کا اشارہ دیا تھا لیکن مصنف نے اسے لائق توجہ نہیں سمجھا۔ 1969 میں جب وہ 'عصرِ جدید' سے علاحدہ ہوگئے تو پھر احمد سعید ملیح آبادی نے ان کو پیغام دیا۔ پھر انھوں نے معذرت کی لیکن بعد میں کچھ عرصے کے لیے بوجوہ مصنف نے 'آزاد ہند' جوائن کرلیا اور ترجمہ کے ساتھ نیوز ایڈیٹنگ کے کام کو ترجیح دی۔ (صفحہ 246)

'اخبارِ مشرق' کلکتہ اور دہلی کے مالک و مختار وسیم الحق صاحب ایک زمانے میں کلکتہ سے 'فلم ویکلی' نکالتے تھے۔ مصنف نے ان سے اپنے دیرینہ تعلق اور دوستی کا اظہار کیا ہے۔ جاوید نہال جن کا ذکر 'عصرِ جدید' کی عدالت میں جھٹکا کی فہرست میں آچکا ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ وہ آگے چل کر کلکتہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور اردو کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ہوئے۔ (صفحہ 248) مصنف نے یو ایس آئی ایس کے زیرِ اہتمام ملک کی کئی ریاستوں کی سیر کی جن میں آسام بھی شامل ہے۔ وہاں کی روداد بھی دلچسپ ہے۔ 22 نومبر 1963 کو جب صدر کنیڈی کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ دھنباد کے ایک ہوٹل میں ٹور پر تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب یو ایس آئی ایس کے انفارمیشن آفیسر پی ایف گولڈ کو یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے ایک منٹ کی دعائیہ خاموشی کے بعد ہی اپنے ٹور پروگرام کو حسبِ منصوبہ جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ صدر کنیڈی کے قتل کے بعد امریکیوں کو کام دھندا بند کرکے بیٹھتے نہیں دیکھا بلکہ اور بھی سرگرم عمل پایا۔ مصنف کا خیال ہے کہ کسی قوم کو آگے لے جانے میں، طاقتور بنانے میں اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے میں افراد کے اس کردار کو خاص دخل حاصل ہوتا ہے۔ (صفحہ 269)

اس باب میں 'اردو صحافت' کے زوال پر مصنف نے مزید بہت کچھ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چند صفحات میں 488 صفحات کی کتاب کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

مصنف اسی باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارے برصغیر میں ایک عجیب ستم ظریفی اور بدقسمتی ہے کہ یہاں کے دانشور زیادہ فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔'' (صفحہ 277)

اسی باب (دوسرے ورق) میں مصنف نے ذکر کیا ہے کہ یو ایس آئی ایس میں کام کے دوران ابتدا میں ان کا نشانہ دہلی تھا۔ جب 27 اگست 1975 کو کلکتہ میں یو ایس آئی ایس، نئی دہلی کے مسٹر میرین نے دہلی آفس کے اردو ایڈیٹر کے لیے رضوان اللہ (فاروقی) کو آفر دیا تو کچھ پس و پیش کے بعد انھوں نے ہامی بھر لی۔ اس طرح جون 1951 میں کلکتہ میں جس کریئر کا انھوں نے انتخاب کیا تھا اس کا ڈراپ سین ہوگیا۔ دہلی میں ان کے کریئر (Diplomatic Journalism) کا آغاز 7 دسمبر 1975 کو ہوا۔ 24 سال کلکتہ میں پاپڑ بیلنے کے بعد جب وہ 30 نومبر کی شام ہاوڑہ اسٹیشن پر پَر تول رہے تھے تو الوداع کہنے کے لیے صرف ایک شخص بدر عالم نظامی آئے تھے۔ اس باب کے آخر میں مصنف لکھتے ہیں:

''اس مستقل ہجرت سے پہلے کوئی ایسی تقریب یا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے یہ گمان گزرتا کہ کچھ لوگوں سے میری شناسائی بھی رہی ہے۔ میں دہلی آنے کے بعد اکثر سوچتا رہا یہ میری کمزوری تھی یا میرے حلقہ کی یا میرے ہم پیشہ لوگوں کی، یا یہ ایک بہت بڑے شہر کی سرد مہری تھی۔'' (صفحہ 284)

کتاب کا تیسرا باب یعنی تیسرا ورق 285 تا 426 صفحات پر مشتمل ہے۔ 'سفارتی صحافت' کا یہ باب ایک نئی دنیا سے متعارف کراتا ہے جو گزشتہ پیشہ ورانہ زندگی کا تسلسل ہے۔ اس میں ذاتی زندگی کی پیچیدگیاں بھی ہیں اور سفارتی نزاکتوں کے تقاضے بھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ سفارت کار صحافی باہر سے خواہ کیسے ہی نظر آئیں یا انہیں کیسے ہی رنگ میں پیش کیا جائے انھیں مفید کام انجام دینے کے بڑے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا

صحافتی برادری کو ان سے تعاون کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ بالآخر 29 فروری1992 کو رضوان اللہ (فاروقی) صاحب اپنی سفارتی صحافت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اس موقع پر ان کو الوداعیہ دی گئی۔ 25 فروری کو امریکی سفیر ولیم کلارک نے اپنے دفتر میں عزت افزائی کی۔

کتاب کا چوتھا اور آخری باب (ورق) سفر و سیاحت ہے۔ یہ 'ورق' ان مقامات کے بارے میں مصنف کے مشاہدات پر مبنی ہے جہاں ان کو جانے کا اتفاق ہوا۔ اس میں مصنف کے مشاہدات و تجربات کو یقینی طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں کے بڑے شہروں کا سفر کیا۔ بیرونِ ملک میں پاکستان بھی گئے۔ یوروپ اور امریکہ کے شہروں کی سیر بھی کی۔ تلخ و شیریں تجربات ہوئے لیکن ہر مرحلے پر نصرت ان کے حصے میں آئی۔

یہ خودنوشت سوانح بلاشبہ اس عہد کی تاریخ کا حصہ ہے جس میں مصنف نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور سخت سے سخت حالات میں بھی انھوں نے صبر واستقلال اور شکر کے ساتھ اپنے عزم واستقلال کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اس خودنوشت آپ بیتی کی زبان میں سلاست اور سادگی ایسی ہے کہ قاری اگر آغاز کر دے تو ختم کیے بغیر اسے تشفی نہ ہوگی۔

(اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ شمارہ جنوری تا دسمبر 2021)

Mobile: 9953630788

◈◈◈

خودنوشت

اوراقِ ہستی

مصنف/ ناشر	:	رضوان اللہ
صفحات	:	488
قیمت	:	800روپے
سن اشاعت	:	2020
مبصر	:	حامد حسین
مقام	:	ڈومریا تھانہ، رانی گنج، ضلع ارریہ 854334(بہار)

خودنوشت ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود فنکار کی ذات ہے۔ اس میں فنکار کی داخلی اور خارجی زندگی یکجا ہوجاتی ہے، جس میں ہمیں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہوتا۔

خودنوشت سوانح عمری کا مصنف اپنے عہد کی تاریخ کا ایک حصہ ہوتا ہے خواہ وہ حصہ کتنا ہی مختصر ہو، جس سے ان کے مشاہدات اور تجربات جڑے ہوتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'اوراقِ ہستی' اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جس کے مطالعے سے

مصنف کے وسیع تجربات اور مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔ان کے علمی، ادبی، سیاسی اورسماجی نظریات سے بھی آگاہی ملتی ہے۔ یہ کتاب 488 صفحات کے ساتھ چاراوراق پر مشتمل ہے، دیباچہ اس پر مستزاد ہے۔

کتاب کے مطالعے سے جومشترک خوبیاں بیک وقت سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ مصنف نے زبان و بیان کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔اپنی باتوں کورکھتے ہوئے صاف گوئی اور بے لاگ بیانی سے کام لیا ہے۔ بقدرِضرورت انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔

درمیان میں کہیں پورے شعر اور کہیں ایک مصرعے کا برمحل استعمال کرکے اپنی باتوں کوتقویت بخشی ہے۔مناظرِ قدرت کے حوالے سے جوتحریر پیش کی ہے اس میں ادبی چاشنی کی دنیا آباد کردی ہے۔

120 صفحات پر پھیلا ہوا اس کتاب کا پہلا ورق مصنف کے ابتدائی حالات پرمبنی ہے ۔تعلیم وتربیت کے حوالے سے سمبھی، کوئریاپار، دبستانِ کانپور اور مدرسہ فیض عام جیسی جگہوں کا اس ورق میں بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں مصنف کی ابتدائی تعلیم وتربیت کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اس کے بعد جونپور، کلکتہ، دیوریا اور بنارس جیسے مقامات کا بالترتیب بیان بھی ہے، جہاں مصنف نے تلاشِ معاش کے کٹھن مراحل طے کیے۔

اس ورق میں پیش کیے گئے واقعات اور حادثات کا تعلق برصغیر کے ایک انقلاب انگیز دور سے ہے۔ جہاں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر زبردست تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ ایسے میں اپنی جگہ پاؤں جمائے رکھنا بڑے حوصلے کی بات تھی لیکن مصنف نے حوصلے کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیا۔ پریشانیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی عمدہ مثال قائم کی۔

دوسرے ورق میں مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی کا باضابطہ آغاز اورصحافت سے وابستگی کا ذکر ہے۔ 1951 سے 1975 تک سرزمین کلکتہ پر مصنف کی صحافتی زندگی اوراس

درمیان پیش آنے والے واقعات وتجربات اور مشاہدات کا بیان ہے۔

صحافت کی تعریف، اردو صحافت آزادی کے بعد، صحافت کا ایک نیا باب، سفارتی صحافت، اس باب میں ایسے مخصوص عناوین ہیں جن سے صحافت کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے مصنف کی فکرمندی صاف طور پر عیاں ہوتی ہے۔

سیاسی اور سرمایہ دارانہ حملے سے صحافت اور اس سے جڑے افراد کو جن مشکلات کا سامنا تھا مصنف نے ان کا بھی بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ کلکتہ کو الوداع کہنے سے پہلے 18 سال 'عصرِ جدید' اس کے بعد 'آزاد ہند' سے وابستگی اسی اثنا میں سفارتی صحافت سے جڑنے کا واقعہ بھی مذکور ہے۔ اس نے مصنف کی زندگی کے تجربات کا بیش بہا خزانہ عطا کیا، زندگی کی سخت کوشیوں کے عوض آسائشوں سے لذت آشنا کیا۔

تیسرا ورق مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی کے تسلسل کا اظہار ہے۔ اس ورق میں شامل نئی دنیا، نئے شہر، نیا آفس جیسے عنوان میں مصنف کی دہلی میں سفارتی صحافت کا بیان ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ہونے والے سفارتی اسفار کا ذکر ہے۔

مجموعی طور پر یہ ورق دہلی سے مصنف کی سفارتی صحافت کے آغاز واختتام اور اس دوران پیش آنے والے واقعات وحادثات کا عمدہ اظہار ہے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ عالمی منظرنامے پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، ان پر بھی مصنف کی آفاقی نظر تھی۔ جس کا اندازہ اس ورق کے اختتامیہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ سوویت یونین باقی نہ رہا، جس نے مغرب سے نمو پذیر ہونے کے باوجود سارے مشرق کو بیداری کا پیغام دیا تھا، سوشلزم کی راہ دکھائی تھی، ہندوستان کا سب سے بڑا دوست اور امریکہ کا سب سے بڑا حریف نہ رہا۔ ہم نے عالمی سیاست میں یہ انقلاب بھی دیکھا۔ پھر ہندوستان اور امریکہ کی دو عظیم جمہوریتوں کو ایک دوسرے کی طرف لجائی لجائی

نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا۔اس طرح وقت کی سوئی نے ایک گردش تقریباً مکمل کر لی۔ اس تمام عرصے میں ہم نے دنیا کے سب سے بڑے اطلاعاتی نظام کو نئے نئے رخ بدلتے دیکھا۔ اس کی کارکردگی برسرِ اقتدار سے ہم آہنگ اور بیرونی تغیرات سے نبرد آزما ہوتے دیکھا۔ہم جیسے کمتر انسانوں کی زندگی میں یہ یقیناً بیش بہا تجربات تھے۔

چوتھا اور آخری ورق مصنف کی سیر وسیاحت کا بیان ہے۔اس ورق میں 23 ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر میں کتنی وسعت ہے۔ ان عناوین میں بطور خاص 'یادوں کے جھروکے' اور 'نئی دنیا سے آشنائی' قابلِ ذکر ہیں۔

''یادوں کے جھروکے'' کے تحت مصنف نے اندرونِ ملک ہونے والے اسفار کا ذکر کیا ہے۔ 'نئی دنیا سے آشنائی' میں بیرونِ ملک ہونے والے اسفار کا تذکرہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر اردو اور انگریزی کے ممتاز صحافی، شاعر اور ادیب رضوان اللہ کی کتاب ''اوراقِ ہستی'' قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔مصنف کی زندگی کی جھلکیاں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ گہرے تجربات، وسیع مشاہدات اور فکری بلندی کے آمیزے سے کتاب کافی وقیع ہوگئی ہے۔اسلوبِ بیان کی دلکشی اور شگفتگی سے پوری کتاب میں کام لیا گیا ہے۔امید ہے کہ خودنوشت کے باب میں اس کتاب کو اہم مقام حاصل ہوگا۔

(اردو دنیا)

◈◈◈

اوراقِ ہستی: ایک مطالعہ

ڈاکٹر مغیث احمد
شعبۂ فارسی، بی.ایچ.یو، وارانسی، یوپی

رضوان اللہ صاحب کی تحریروں سے میری شناسائی تقریباً دوعشروں پر محیط ہے۔ ''اوراقِ ہستی'' دراصل ان کی خودنوشت سوانح ہے، جو ان کے تخلیق آشنا ذہن کی حقیقی تعبیر ہے۔جس میں ان کا تخلیقی کمال اپنی متنوع جہات سے روشنی بکھیر رہا ہے۔اسے آپ بیتی، شہر بیتی اور سماج بیتی کا مثلث بھی کہا جاسکتا ہے۔

خودنوشت کا چلن اگرچہ کمیاب ہوتا جارہا ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ یہ صنف اپنے عہد کی تاریخی، تہذیبی، سماجی وسیاسی حالات کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ایک ماہر خودنوشت نگار کے فن پارے سے جہاں ہم اس کے حالات زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہیں اس کے عہد کے رسم ورواج، طرزِ معاشرت، سیاسی وسماجی حالات اور تہذیبی وتعلیمی کیفیت سے بھی بھرپور آگہی حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ سبھی باتیں ہمیں ''اوراقِ ہستی'' میں پورے طور پر ملتی ہیں۔

رضوان اللہ صاحب کی تحریروں میں اتنا تنوع ہے کہ قاری کبھی بھی اکتاہٹ محسوس

نہیں کرتا، بلکہ صفحہ بہ صفحہ مزید تازگی، فرحت اور توانائی کشید کرتا رہتا ہے۔ مصنف نے ''اوراقِ ہستی'' میں مختلف مقامات کے تخلیقی شعور کو عبارات و اشارات میں سمیٹ کر کولاژ کی شکل دے دی ہے، جس میں فکر کی بلندی ہے، طنز کے تیر ہیں اور مزاح کی شگفتگی بھی ہے۔

''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' لیکن 'حکایتِ ہستی' جو درمیاں سے سنی، وہ کچھ اس طرح ہے کہ ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دورافتادہ گاؤں سمبھی میں جہاں میرا ننہیال تھا، میں نے حیرت کدۂ عالم پر پہلی نظر ڈالی۔ وہ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کوئی تاریخ تھی، لیکن جب اسکول میں داخلہ ہوا تو میری تاریخ پیدائش ۱۵/جولائی ۱۹۳۱ء درج کرائی گئی چنانچہ مستند تاریخ وہی ہے۔'' — میری عمر کے پہلے سال کے بارہ مہینے بھی نہیں پورے ہوئے تھے کہ میری ماں نے اس شیرخوار کو اپنی ماں کے آنچل میں ڈال کر رحلت فرمائی۔ ایک ناعاقبت اندیش سانپ اس کا موجب ہوا— قرآن اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی لیکن اس کی ابتدا سے پہلے ہی میں دیگر مشاغل شروع کر چکا تھا— پاؤں نکالے تو گھر کی چہار دیواری کے باہر کھیت کھلیان، پیڑ پودے، باغات میدان اور پوکھرے تالاب میری جولانگاہ تھے — بڑوں کی ساری توجہات کے باوجود میں اپنے پسندیدہ مشاغل کے لیے راہیں تلاش کر لیتا اور اس میں نہ گرمیوں کی تپش نہ جاڑوں کی ٹھار حائل ہوتی۔ رفتہ رفتہ پیڑ پر چڑھنے کا فن بھی سیکھ ہی نہیں لیا بلکہ اس میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ تاڑ کے علاوہ کوئی درخت خواہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو میری دسترس سے نہیں بچ سکتا تھا۔ آگے چل کر مچھلی اور چڑیوں کا شکار لڑکپن کے مشاغل میں شامل ہو گیا۔ غلیل، کمپا، مچھلی پکڑنے کے لگے کانٹے وغیرہ میری دلچسپیوں کے سامان ہو گئے۔ اپنی ان مصروفیات کو جاری رکھنے کے لیے مجھے چھری، چاقو، ہولڈر کی نب جیسی چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی۔ جب باورچی خانے سے چھری یا قلمدان کے ہولڈر سے نب غائب ہوتی تو سب سے پہلے اس کی پرسش مجھ سے ہی ہوا کرتی— تین ہم جولیوں یعنی میرے سمیت چار کی ایک ٹولی تھی، جو دھول، کیچڑ، پانی، کھیت کھلیان، باغ

اور ویرانے میں بیک جان چہار قالب موجود رہتی — کسب ہماری جبلت تھی اس لیے فصل کے مطابق آم، جامن، امرود، انار، بیر گولر وغیرہ پھل جب اور جہاں دستیاب ہوتے حسبِ توفیق بدست خود دہان خود کے اصول پر عمل کرتے — میری نانی نے جو بیوہ تھیں میری ماں کے آخری لمحات میں اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جس شیر خوار کو چھوڑے جا رہی ہیں اسے وہ اپنے گلے کا تعویذ بنا کر رکھیں گی اسی تعویذ کی برکت تھی کہ میں بالکل آزاد تھا — میرے شعور نے ابھی پوری طرح آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ ایک دن اُن بزرگہ کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ وہ اپنے وعدے سے پھر گئیں اور اس تعویذ کو نوچ پھینکا — جولائی کی ابتدائی تاریخیں رہی ہوں گی، سال ۱۹۳۷ء رہا ہوگا میرے ماموں مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمؔن شہابی گرمی کی چھٹیاں گزار کر کانپور واپس جا رہے تھے۔ وہ میری نانی کے اکلوتے بیٹے تھے کانپور میں اسکول ٹیچر تھے، نانی نے مجھے ان کی تحویل میں دے دیا — اعظم گڑھ سے کانپور کا فاصلہ تب بھی دس گھنٹے کا تھا اب بھی دس گھنٹے کا ہے — اعظم گڑھ اور شاہ گنج کے درمیان تو خیر چھوٹی لائن تھی۔ شاہ گنج میں جب ہم لوگ دہرہ دون ایکسپریس میں سوار ہوئے تو وہ چند بوگیوں پر مشتمل نفیس ٹرین تھی اور مسافروں کا یہ عالم تھا کہ ٹرین چھوٹنے کے بعد ماموں جان نے اپنی شیروانی کو سیٹ پر بچھایا اور مجھے یہ ہدایت کر کے تم نہ سونا خود سو گئے۔ ہم سوتے بھی کیسے ہمارے لیے تو سب کچھ نیا تھا، ان کو دیکھنا بھی تھا۔ تیز رفتار ریل گاڑی کے قریب کی زمین کو اتنی ہی تیز رفتاری سے پیچھے بھاگتے اور دور کی آبادیوں، پیڑ پودوں کو نسبتاً کم رفتار سے ٹرین کی سمت میں چلتے رہنے کا حیرت انگیز مشاہدہ پہلی بار ہوا تھا۔'' (ص: ۱۹ تا ۲۵)

رضوان اللہ صاحب نے اپنی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کو بڑے صبر و استقامت سے جینے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ معاشی تنگی کے باعث تعلیمی سرگرمیوں کو قسطوں میں مکمل کیا اور لمحات زیست کی مختلف ناخوشگواریوں کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اسے اپنی شگفتہ تحریروں میں سمو کر قارئین کے لیے بھی دلبستگی کا سامان میسر کیا ہے۔

موصوف عہد طفولیت کی مختلف سرگرمیوں مثلاً چڑیوں کا شکار، کبڈی، فٹ بال، گلی ڈنڈا، تیراکی، درختوں پر چڑھنا، کشتی رانی، سائیکل سواری، تاش، شطرنج، فلم بینی وغیرہ وغیرہ کے علاوہ عملی میدان میں بھی ہرفن مولیٰ رہے ہیں۔ پھلوں کی تجارت کی، کلرکی سے وابستہ رہے، ریلوے کی مشقت طلب ملازمتیں کیں، کچہری میں نقل نویسی کا عمل انجام دیا، پی آر ڈی کے انچارج رہے اور آخر میں صحافت کے پیشے کو اعزاز بخشا اور اپنے عمل پیہم اور آہنی عزم کی بدولت ایام حیات کی مشقتوں اور پریشانیوں کو بالآخر مات دے کر آرام وسکون کے خوشگوار لمحات بھی حاصل کیے، لندن وامریکہ گئے اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام بھی کیا۔

رضوان اللہ صاحب کی کتاب حیات تقریباً نو دہائیوں کو محیط ہے مگر ان کے تجربات ومشاہدات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، وہ اپنی زندگی سے جڑے واقعات کو بڑے دلکش انداز میں ایجاز واختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی دادی کی بزرگی اورخرق عادت باتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک بار نانی بہت پریشان تھیں کہ کانپور سے بہت دنوں سے حفیظ الرحمٰن (میرے ماموں جان) کا خط نہیں آیا ہے۔ دادی حسبِ معمول کمرے سے باہر آئیں تو نانی نے ان سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ دونوں سمدھنیں ایک دوسرے کو' بہن' کہہ کرمخاطب کرتیں۔ نانی کی باتیں سنتے ہی دادی دوزانوں بیٹھ گئیں، سر پر لیٹا ہوا دوپٹہ ذرا سامنے کو کھینچ لیا، پھران کی آواز بدل گئی اور یوں بولتی چلی گئیں جیسے کوئی رننگ کمنٹری دے رہا ہو۔ ''ڈاکٹر آیا ہے، کلائی میں زخم معلوم ہوتا ہے، پٹی لپیٹی جارہی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ چند دنوں بعد ماموں جان کا خط آیا، واقعی ان کی کلائی میں پھوڑا نکل آیا تھا، دادی کی اس کیفیت کی کوئی تاویل یا تشریح نہیں کی جاسکتی۔'' (ص:۴۷)

موصوف ایک جگہ' کوئریا پار' کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محترم خلیل الرحمٰن بھائی (شمس الرحمٰن فاروقی کے والد) نے اپنی تصنیف

''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' میں لکھا ہے کہ گاؤں کی شمال مشرقی حدوں کے قریب ایک تالاب ہے اس کے پوربی کنارے پر زمانۂ قدیم کا ایک مزار ہے جو لکھوری اینٹوں کا ہے۔ وہ مزار ایک بزرگ کوڑیا شاہ کا ہے، انہی کی نسبت سے اس گاؤں کا نام 'کوڑیا پار' ہوا۔ عین ممکن ہے کہ اس علاقے میں وارد ہونے والے اولین بزرگوں میں وہ شامل رہے ہوں۔'' (ص:۴۹)

رضوان اللہ صاحب ایک کہنہ مشق صحافی، ماہر مترجم، طنز و مزاح نگار اور منجھے ہوئے شاعر ہیں، انھیں اردو، فارسی اور انگریزی پر یکساں مہارت ہے۔ ان کی اردو، فارسی اور انگریزی کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ وہ کس زبان میں زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں جن باکمال شخصیات کا مشاہدہ کیا ہے، رضوان اللہ صاحب بلاشبہ ان میں سے ایک ہیں۔ موصوف کی تحریروں میں جابجا شوخی و مزاح کا رنگ جھلکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہاں ضمناً یہ بیان کر دینے میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا کہ ہمارے درختوں پر جو آم نونیوں کی دسترس سے باہر ہوتے وہ میری دسترس سے نہیں بچ سکتے تھے، اس سے پیڑ پر چڑھنے میں میری مہارت اور بے خوفی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔'' (ص:۵۰)

مصنف اپنے ابتدائی اساتذہ میں سے ایک کی تنک مزاجی کا ذکر چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......وہ مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے اور بچوں کو پڑھانے لگے تھے لیکن بڑے چڑچڑے تھے۔ اس لیے مارتے زیادہ اور پڑھاتے کم تھے۔ ابا میری مرمت کی کہانیاں سن کر ان سنی کر دیتے۔ اس زمانے میں بچوں کی کھال کھینچنا استاد کا استحقاق تھا۔ کہاوت تھی کہ ماں باپ بچے کو استاد کے حوالے کرتے تو کہہ دیتے کہ اس کی ہڈی گڈی ہماری اور کھال آپ کی۔'' (ص:۶۲)

مصنف ایامِ طفلی میں گرمیوں کی چھٹیوں کا معمول بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبح فجر کے وقت ہم سب کو اٹھنا ہی پڑتا اس لیے کہ سارے بزرگ گھروں سے نکل کر مسجد کو جاتے ہوئے ہم لوگوں کو نام بہ نام پکارتے جاتے یا ٹہوکے لگاتے جاتے۔ صبح کا کچھ وقت ادھر ادھر چہلوں میں گزارنے کے بعد ناشتے پر ٹوٹ پڑتے۔...... ناشتے کے بعد اگر بزرگوں نے کسی کام سے لگا دیا تو اسے نپٹانا ہی پڑتا، اسی لیے حتی الوسع بزرگوں کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتے۔'' (ص:٦٣)

مصنف عمر کے ایسے پڑاؤ پر ہیں، جہاں قلم پکڑنا تو دور لوگوں کے حواس مختل ہو جاتے ہیں، لبوں پر اختیار نہیں رہتا اور بولنے سے کتراتے ہیں مگر انھوں نے ایسے حالات میں بھی نہ صرف کتاب تخلیق کی ہے، بلکہ اپنی شگفتہ تحریر سے جواں عمر قلمکاروں کو مہمیز دینے کا کام کیا ہے۔ ان کا یہ عمل ان کے تخلیقی کمال کا سراغ دیتا ہے۔ مصنف کی زبان بہت سادہ، سلیس اور شستہ ہے، مختصر عبارت میں بہت کچھ کہہ دینے کا کمال رکھتے ہیں، وہ اپنے ایک پڑوسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب کوئریا پار میں ڈاک خانہ قائم ہوا تو ابا کے مشورے پر للّن بھائی پوسٹ ماسٹر مامور ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اردو فارسی اور قرآن تو پڑھ لیا تھا لیکن محکمہ ڈاک کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کی ایک بڑی کوالی فیکیشن تھی وہ یہ کہ انھیں صرف ایک بار کسی طرح بنارس تک جانے کا اتفاق ہوا تھا اور اس طرح انھوں نے ریل گاڑی دیکھ لی تھی، گویا کہ وہ گاؤں کے قطب تھے جو کہ از جا نمی جنبد۔ دوسرے یہ کہ وہ پیسے پر خزانے کے سانپ کی طرح بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ بقول شخصے ان کے دروازے پر نہ کبھی کسی نے ایک بتاشا کھایا نہ ایک بیڑا پان کا۔ انھوں نے نہ کبھی کسی کا ختنہ عقیقہ کرایا نہ اپنے علاوہ کسی کی شادی بیاہ کے چکر میں پڑے۔ ان کی خوش قامتی کرتے پاجامے اور ایک عدد ٹوپی کے علاوہ کسی بار کی متحمل نہ ہوئی اور ان کی پاپوش پالش کے لیے زندگی بھر ایڑیاں

رگڑتی رہ گئی۔'' (ص:۶۵)

موصوف اپنی ایام طفلی کی معصومانہ شرارتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آموں کا نرخ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ بائیس گاہی یعنی ایک سو دس آم کا سیکڑہ مانا جاتا تھا (پانچ کی ایک گاہی ہوتی) چکھنے کی کوئی قیمت نہیں تھی، نہ اس میں کوئی روک ٹوک تھی، چنانچہ ہم بچے کبھی کبھی شرارتاً ایک طرف سے ایک ایک آم چکھتے اور منہ بسورتے چلے جاتے یعنی آم کھٹے ہیں۔'' (ص:۷۷)

بچپن کے ایام اور بھلا شرافت، دور دور تک کا کوئی رشتہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ بچوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ موصوف ایک جگہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کو ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنے کی سوجھی۔ اس کا نام تجویز ہوا ''شیطان''۔ اس کی اشاعت کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا گیا۔ ہم لوگ جمعرات کو کاپی کے چار صفحوں پر مشتمل یہ پرچہ تیار کرتے اس میں محض خرافات اور جھوٹی سچی باتیں ہوتیں۔ جنگ کا زمانہ تھا، جرمنی اور برطانیہ کے نشریات نے ایک ذہنی فضا بنادی تھی اس لیے ''ریڈیو جھوٹستان'' کے حوالے سے خبروں کا ایک کالم رکھا گیا اور پروپیگنڈے کی ٹیکنک کے مطابق اس کالم کے اوپر لکھ دیتے ''لعنۃ اللہ علی الکاذبین''۔ اس پرچے کی ایک ایک نقل جمعہ کی صبح کو ہر جماعت میں رکھ دی جاتی۔ ایک دن ہماری شامتِ اعمال کہ پہلے ہی گھنٹے میں غیر متوقع طور پر مولوی ظفر الدین صاحب آگئے۔ وہ ایک جید عالم تھے، سبز صافہ باندھتے اور ڈھیلی ڈھالی اچکن پہنا کرتے، انھوں نے میز پر تازہ شمارہ دیکھا اور قرآن کی آیت کی بے حرمتی دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئے۔ انھوں نے ہم دونوں کی ایسی مرمت کی کہ اخبار نکالنا بھول گئے یوں آگے چل کر زندگی بھر اخبار ہی اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔'' (ص:۸۲)

موصوف اپنی شوخیوں اور طفلانہ شرارتوں کو بڑی دلچسپی سے مزے لے کے بیان

کرتے ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کے بوسیدہ لمحات سے تازگی، طنز اور شوخی کشید کر کے اپنے قارئین کو شگفتگی اور سرور فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب موصوف نے ہماری دوسری مرمت عزیز الدین کے ساتھ فرمائی۔ بات یوں ہوئی کہ ہیڈ ماسٹر لاری صاحب کا گھنٹہ ایک روز خالی تھا۔ ہم اور عزیز الدین دونوں بلیک بورڈ پر پہنچے اور ایک بیل گاڑی کا جیسا تیسا کارٹون بنایا اور اس کے نیچے لکھ دیا:

ان کی لاری عجیب لاری ہے
کوئی سمجھے کہ بیل گاڑی ہے

ہماری شامتِ اعمال کہ مولوی صاحب کا گھنٹہ خالی تھا، وہی بھیج دیے گئے، بورڈ پر ان کی نظر پڑی تو اطمینان سے دریافت کیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔لڑکوں نے ہمیں نامزد کر دیا۔ آناً فاناً مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور نہ معلوم کہاں سے ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی ان کے ہاتھ آ گئی پھر تو انھوں نے اسی سے ہم لوگوں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر واقعی پھوڑ دی۔'' (ص:۸۳)

موصوف اپنے ٹرین کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں ٹرینوں میں سوار ہونا اور سفر کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہ تھا لیکن ایک آسانی ضرور تھی وہ یہ کہ ٹرین کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں لگی ہوتی تھیں اس لیے ان کھڑکیوں میں سے بھی ڈبوں میں گھسا جا سکتا تھا۔ میں دبلا پتلا تھا اس لیے دروازے پر دھینگا مشتی کرنے کی بہ نسبت کھڑکی سے ڈبے میں گھسنا میرے لیے آسان تھا۔'' (ص:۱۱۰)

۱۹۴۶ء میں کولکاتہ میں ہوئے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے شہر میں زبردست کشت وخون، آتش زنی اور لوٹ مار جاری تھی لیکن تین دن تک پولیس کا کہیں پتہ نشان نہ تھا— پہلے تین دنوں تک تو بالکل نراج کی کیفیت تھی— سڑکوں پر لاشیں بکھری پڑی تھیں، کوئی ماتم گسار تو کیا ہوتا انہیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا......کوئی ہفتہ بھر بعد سڑکوں پر پڑی لاشوں کی کیفیت ایسی نہ تھی کہ کوئی انہیں اٹھاتا، چنانچہ

فوجیوں کی نگرانی میں مردہ جانور ڈھونے والی گاڑیاں لائی گئیں اور کرین سے اٹھا اٹھا کر لاشیں ان میں لادی گئیں، پھر ان کا جو بھی حشر ہوا ہوا...... جب فوج نے گھر گھر تلاشی شروع کی تو لوٹ کا مال لے جانے والوں نے سارا مال سڑکوں پر پھینکنا شروع کیا، اس طرح سڑکوں پر کپڑوں، فرنیچر وغیرہ کے ڈھیر لگ گئے، لوگ ان انباروں میں آگ لگا دیتے، عجب تباہی اور بربادی کا منظر تھا۔'' (ص:۱۱۴)

موصوف قیام بنارس کے دوران اپنی ریلوے کی ملازمت کی سخت کوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبح سات بجے سے شام سات بجے تک انجنوں کی جھاڑ پونچھ کرتا، کوئلہ توڑتا، کوئلہ جھونکتا، ہاتھ زخمی کبھی اس میں آبلے پڑے ہوئے۔ شام کو کالا کلوٹا، میلا کچیلا گھر واپس آتا، نہاتا دھوتا اور کوئی گوشہ اختیار کرتا۔ محنت سخت تھی اس لیے کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو جاتا۔'' (ص:۱۲۶)

بنارس میں تین سالہ قیام کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بنارس میں پہلا رمضان انجمن میں کوئلہ توڑتے بھٹی جھونکتے گزرا تھا، دوسرا قدرے آرام سے گزرا اور تیسرے رمضان میں انٹر کا نتیجہ نکلا۔'' (ص:۱۴۴)

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے موقع پر اپنے حالات و مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بنارس سے بھٹنی تک اسٹیشنوں کی سجاوٹ کے سامان جو ریلوے کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے میں نے تقسیم کیے۔ ہم لوگوں نے اپنے انجن کو بھی سجانے کی کوشش کی تھی، کیلے کے پورے پورے درخت دونوں طرف باندھے گئے جو بنارس سے بھٹنی تک کے سفر میں ہی سوکھ کر جھناٹا ہوگئے۔ ۱۴/اگست کو صبح دس بجے جو بھٹنی گیا تو رات کو دس بجے واپس آیا بہت تھک گیا تھا سو گیا۔ کب آزادی کا گھڑیال بجا نہیں معلوم۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تاریخی تقریر بھی نہیں سنی جو ۱۴/اگست اور ۱۵/اگست کی درمیانی نصف شب کو انھوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے ہال میں کی تھی۔انھوں نے اس تقریر میں کہا کہ ''جب ساری دنیا سوتی ہے تو ہندوستان بیدار ہوتا ہے۔'' آج سوچتا ہوں تو حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے، جو اس کے برعکس تھی......سوچتا ہوں کہ سیاست کیسا طلسم سامری ہے جو صریح غلط کو بالکل صحیح ہونے کا یقین دلا دیتا ہے۔کسی نے اس تاریخی غلط بیانی کی تردید نہیں کی۔'' (ص:۱۳۴)

غرض یہ کتاب نہ صرف رضوان اللہ صاحب کی آپ بیتی ہے بلکہ ان کے عہد کی اخلاقی،سماجی، سیاسی، ادبی، دینی اور ثقافتی حالات کی غماز بھی ہے، ضمنی طور پر اس میں ستمگر زمانے کے دوش پر لہرائے گئے دسیوں اہل کمال کا تذکرہ اور ان کے خاکوں کی جھلک بھی موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اپنے اسلاف کے طرزِ زندگی، سادگی، رواداری اور خلوص وللّٰہیت کا بھی بھرپور پتہ چلتا ہے۔

کتابیں تو بہت ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہوتی رہتی ہے مگر رضوان اللہ صاحب کی کتاب یقیناً ہمارے لیے ایک اہم علمی اثاثہ ہے، جس کے مطالعے کی خوشبو برسوں ذہن کو معطر کرتی رہے گی۔

خودنمائی اور خودستائی سے کوسوں دور رہنے والے رضوان اللہ صاحب کی شخصیت واقعی لاجواب ہے۔ وہ جہاں ایک بڑے تخلیق کار ہیں وہیں ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ انکساری، شفقت اور چھوٹوں کا خیال ان کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں۔عمر میں میرے والد مرحوم سے بھی ایک دو سال بڑے ہیں مگر اپنی کتابوں کو ہدیۃً عنایت کرتے ہوئے ناچیز کو'برادرم' سے مخاطب کرنا، ان کی غایت کسر نفسی اور عظمت کی ہی غمازی کرتا ہے۔

عین کورونا کے مہلک وبا کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب تخلیق کر کے واقعتاً انھوں نے بڑے بڑے قلمکاروں کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔ ان کی حالیہ تصنیف نے یہ ثابت

کر دیا ہے کہ آندھیوں میں چراغ جلانا ہی درحقیقت اصل کمال ہے۔

سوانح، آپ بیتی اور خودنوشت کا عمل جہاں معدوم ہونے لگا ہے، وہیں اس کی ادبی حیثیت سے بھی لوگوں کی دلچسپیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔اس میں جہاں قارئین کی کوتاہ نظری شامل ہے، وہیں لکھنے والوں کی تحریری ثقل بھی ایک اہم وجہ رہی ہے۔''اوراقِ ہستی'' یقیناً اس صنف کو حیات نو بخشنے میں معاون ثابت ہوگی۔

تقریباً پانچ سو صفحات پر محیط ''اوراقِ ہستی'' چار ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کو مصنف نے 'ورق' سے تعبیر کیا ہے۔ پہلا ورق ایامِ طفلی، خاندانی پس منظر، تعلیم وتربیت اور تلاش معاش کے ابتدائی حالات پر مشتمل ہے۔'دوسرا ورق' مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے اور 'تیسرا ورق' پیشہ ورانہ زندگی اور اس سے جڑے امور پر مشتمل ہے، جب کہ 'چوتھا ورق' سفر و سیاحت اور جہاں گردی سے جڑے مشاہدات و تجربات پر مشتمل ہے۔زیرِ نظر مضمون میں صرف پہلے ورق سے متعلق کچھ باتیں ضبط تحریر کر دی گئی ہیں، آئندہ کے اوراق اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں جو لازمی طور پر کسی بھی ناول یا افسانے سے کم دلچسپ نہیں ہیں۔خدا مصنف موصوف کے فیوض کو مزید وسعت بخشے۔

ڈاکٹر مغیث احمد
شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی، یوپی
E-mail: moghees.ahmad5@gmail.com
Mob.: 9891567738

◈◈◈

کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخی مگر حزنیہ داستان

سہیل انجم

رضوان اللہ صاحب کی تازہ اور زیرِ تذکرہ تصنیف کلکتہ کی اردو صحافت کے تعلق سے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی مدد سے نہ صرف کلکتہ کی اردو صحافت کے نشیب وفراز سے اردو قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ اپنی صحافتی زندگی کی ناہمواریوں سے بھی انھیں روبرو کرایا ہے اور شاید انہوں نے ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے اردو صحافیوں کو ایک سبق بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کتاب کی ابتداء ناخدائے سخن میر تقی میؔر کے عبرت انگیز شعر کو استعمال کرتے ہوئے کی ہے۔ میں سب سے پہلے اس اقتباس کو جو کہ کتاب کا پہلا اقتباس ہے اور جس میں اس شعر کا استعمال کیا گیا ہے، پیش کرنا چاہوں گا۔ ”یہ ۱۹۵۱ کی بات ہے۔ کلکتہ کی برسات کا شباب اتار پر تھا لیکن آدمی کا وجود بلا رکشہ کھینچے بھی کھڑے کھڑے برف کی طرح پگھلا جاتا تھا کہ میرا پاؤں کلکتہ کی اردو صحافت کے مردہ جسم پر اسی طرح اتفاقاً آ گیا جیسے میؔر کا پاؤں ”ایک کاسۂ سر“ پر آ گیا تھا اور یہ بھی ہوا

کہ آزادیِ وطن کے جلو میں کشت وخون کی وجہ سے ''یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا'' اور وہ بھی مجھ سے کہنے لگا کہ ''دیکھ کے چل راہ بے خبر۔ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا۔''

دراصل یہ صرف اقتباس نہیں بلکہ پوری کتاب کا یا یوں کہیں کہ کلکتہ کی اردو صحافت کا نچوڑ ہے۔ پوری کتاب میں ان چند سطور کی تشریح پیش کی گئی ہوتی تب بھی یہ چھوٹا سا اقتباس کلکتہ کی اردو صحافت پر ایک بھرپور تبصرہ تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس اقتباس میں جو درد و کرب اور سوز وگداز ہے وہ پوری کتاب میں بھی موجود ہے۔ البتہ انہوں نے یہ سوچ کر کہ قارئین بور نہ ہو جائیں، اپنی ظرافت طبع کا استعمال کیا ہے اور جگہ جگہ اپنے جملوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑی ہیں۔

کلکتہ شہر یا وہاں کی صحافت اور وہاں کی تہذیب وثقافت رضوان اللہ کی شخصیت اور مزاج میں رچ بس گئی ہیں۔ اس شہر سے ان کا چونکہ ۲۴ برسوں تک تعلق رہا ہے اس لیے دہلی آکر بھی وہ اس کو فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ''اوراقِ مصور'' کے عنوان سے مثنوی لکھ کر کلکتہ سے اپنے قلمی وقلبی لگاؤ کا ثبوت دیتے ہیں تو کبھی کلکتہ کی اردو صحافت پر کتاب تصنیف کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے اس آخری پڑاؤ میں بھی کلکتہ شہر' جس پر غالب فریفتہ ہو گئے تھے، ان کے ذہن ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ۱۹۹۱ میں آخری بار کلکتہ کو دیکھا تھا لیکن ان کی کتاب کے اوراقِ پریشاں بتاتے ہیں کہ انہیں اب بھی اس شہر نگاراں سے وہی انسیت ومحبت ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ''کلکتہ سے میرا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ قلمی سے زیادہ قلبی تھا اور وہ ناقابلِ شکست تھا۔'' ۱۹۵۱ سے ۱۹۷۵ تک کا ایک طویل عرصہ انہوں نے کلکتہ میں گزارا اور بیشتر اخبارات کو اپنا خون جگر پلایا۔ ان چوبیس برسوں میں کلکتہ نے ان کو کچھ دیا نہیں بلکہ ان سے ان کا عنفوان شباب لے لیا' ان کی صحت وتندرستی لے لی اور ان کی توانائی کو اردو اخبارات کے لیے آکسیجن بنا کر رکھ دیا۔ پھر بھی وہ کلکتہ اور وہاں کی صحافت سے

بدظن نہیں ہوئے۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کا عشق یکطرفہ تھا۔ کتاب کے سطور اور بین السطور سے اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کلکتہ کو خیر باد کہنے کے بعد رضوان اللہ صاحب نے دہلی میں امریکی انفارمیشن سنٹر میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے ایک ماہ قبل ان کی ڈائرکٹر نے ان سے کہا تھا کہ وہ کلکتہ جا کر اپنے دوستوں کو الوداع کہہ آئیں۔ لیکن تمام تر آسائشوں کے باوجود وہ نہیں جا سکے۔ دل کی بیماری نے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالدی تھیں۔ اس واقعہ کا ذکر انہوں نے انتہائی پرسوز انداز میں کیا ہے لیکن اس پر اپنی ظرافت کا چھڑکاؤ کر کے اس کو شوگر کوٹیڈ کردیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ''بیماری اور دواؤں کے مسلسل استعمال کی وجہ سے اتنی کمزوری آ گئی تھی کہ سفر کی ہمت نہ کرسکا۔ وہ تو دفتر والوں کی انتہائی مہربانیاں تھیں کہ ریٹائرمنٹ تک پہنچنے کے لیے درکار دس ماہ کی مدت گزار لی۔ وہ کوئی عصرِ جدید کا دفتر تو تھا نہیں جہاں اٹھارہ برس کاٹنے کے بعد عین بیماری کی حالت میں مجھ پر دروازے بند کردیے گئے اور واجبات کے نام پر ایک پیسہ نہیں دیا گیا۔''

ان کا آخری جملہ صرف 'عصرِ جدید' پر ہی نہیں بلکہ کلکتہ کی صحافت اور میں تو کہوں گا کہ پوری اردو صحافت پر ایک بھرپور اور طنز آمیز تبصرہ ہے۔ انھوں نے ہمت جٹائی اور اپنے درد و کرب کو خوبصورت انداز میں بیان کردیا۔ بہت سے لوگ تو اس کی جرأت بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے واقعات جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں، جو ان کے ۲۴/سالہ صحافتی سفر میں نشانِ عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔

''کلکتہ کی صحافت اور میں'' صرف کلکتہ کی اردو صحافت کا حزنیہ بیان نہیں بلکہ اس کے حوالے سے مسلم معاشرے کا ایک تجزیاتی مطالعہ بھی ہے۔ تقسیمِ وطن کے جلو میں اس معاشرے کی شکست و ریخت، صحافت کی بے زبانی اور بے سمتی، مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی اور بے اثری، احساسِ شکست اور غیر یقینی مستقبل پر ایک بے لاگ و بے باک تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ

صاحبِ کتاب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔عنوانات ملاحظہ ہوں: ۱۹۴۷ء کا انقلاب اور مسلم سیاست، مضمحل صحافت اور سراسیمہ قاری، تذکرہ مسلم اداروں کا، بہار میں خزاں، پریس کمیشن کا قیام، نئے دور کا آغاز، بنگلہ دیش کی تحریک، مسلمانوں کی سراسیمگی، جنگ کی اثرات، ایمرجنسی اور سنسرشپ، بنگلہ دیش میں انقلاب، اردو نیوز سروس، پبلسٹی اور پروپیگنڈہ، خبر اور افواہ اور ڈس انفارمیشن وغیرہ۔

اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان میں ضمنی عنوانات باندھ کر کلکتہ کی اردو صحافت کے گیسوئے خمدار کی گرہیں گنوانے کی کوشش کی گئی ہے۔'عصرِ جدید'، 'الحق'، 'روزانہ ہند'، 'امروز'، 'انگارہ'، 'اخوت'، 'ایثار'، 'کندن'، 'نباض'، 'ایشیا'، 'فانوس ڈائجسٹ'، اخبارِ مشرق'، 'سیاست'، 'آزاد ہند'، 'آبشار'، 'غازی'، 'عکاس'، 'ہلال'، 'کسان مزدور'، 'ہوڑہ ٹائمز'، 'بخشیات'، 'مشرقی ہند'، 'آرزو ہند'، 'اسپورٹس ٹوڈے'، 'اسپورٹس انڈیا'، 'محرک' اور 'عاقبت' وغیرہ اخبارات ورسائل میں سے بعض کا تفصیلی ذکر ہے اور بعض کا اجمالی۔ان اخبارات کی تاریخِ اجراء بھی ساتھ ساتھ دے دی گئی ہے اور وہاں کے کارکنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ اردو صحافت کا آغاز کلکتہ سے ہوا ہے اور اسی لیے انھوں نے کلکتہ کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں کہا ہے۔اردو اخبارات کے پتھر کے دور پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے اور کمپیوٹر ایج کی صحافت کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ پتھر کے دور میں پیش آنے والی دشواریوں کو بھی گنایا گیا ہے۔انھوں نے کلکتہ کی اردو صحافت کے سلسلے میں عہدِ نو کے عنوان سے بھی ایک حصہ شامل کیا ہے، جس میں روزنامہ اخبار مشرق پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''۱۹۸۰ء کے آس پاس اخبارِ مشرق کی اشاعت سے کلکتہ میں آفسیٹ مشین پر اردو اخباروں کی اشاعت کا آغاز ہوا۔کمپیوٹر کے ذریعہ کمپوزنگ کے رواج کو ابھی مزید بیس برس باقی تھے۔اس آغاز کا سہرا بھی اخبارِ مشرق کے سر ہے، جس کا دہلی ایڈیشن بھی جاری ہے۔اس اعتبار سے کلکتہ کے اخباروں میں اخبارِ مشرق کو

ایک منفرد مقام حاصل ہے۔'' اس ضمن میں انھوں نے اخبارِ مشرق کے مدیر وسیم الحق کی ادارتی وصحافتی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ بقول ان کے کلکتہ کے اردو اخبارات کی پالیسی حکمراں پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانے کی رہی ہے۔ لیکن وسیم الحق نے بندھے ٹکے دائرے سے کسی قدر گریز کیا اور اپنی آزادانہ اور غیر جانبدرانہ پالیسی کا اعلان کر دیا۔

آخر میں آخری بات کے عنوان سے انھوں نے موجودہ اردو صحافیوں کو کچھ نصیحتیں کی ہیں، کچھ مشورے دیے ہیں اور کچھ پیغام بھی دیا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو سامنے رکھ کر آج کے صحافی موجودہ مقابلے کے دور میں خود کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اردو صحافت کے روشن مستقبل کی بشارت بھی دی ہے اور جب رضوان اللہ جیسا جہاں دیدہ اور صحافت کی بھٹی میں جل کر کندن بن جانے والا صحافی ایسی بشارت دے تو اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا وہ یہ کہ انھوں نے بعض تلخ باتوں کو اپنی بذلہ سنجی سے شوگر کوٹیڈ تو کر دیا ہے لیکن بہت سی باتیں کیپسول کے اندر کی دوا کا ذائقہ رکھتی ہیں۔ چونکہ حق بات تلخ ہوتی ہے اور اسے برداشت کرنے کا مادہ معدودے چند لوگوں میں یا یوں کہیں کہ مزاجاً اور طبعیتاً بڑے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو پڑھ کر جہاں غیر کلکتوی لوگ محظوظ ہوں گے اور تلخ حقائق سے روشناس ہوں گے وہیں مجھے اندیشہ ہے کہ کلکتہ کے کارپرداز صحافت کی پیشانیوں پر ناگواری کے بل پڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کا اندازہ مصنف کو نہ رہا ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے کلکتہ کے کارپردازان صحافت وسیاست کا اصلی چہرہ لوگوں کو دکھانے میں تردد سے کام نہیں لیا ہے۔

بہرحال یہ کتاب کلکتہ کی اردو صحافت سے صرف رضوان اللہ کے تعلق اور رشتے کی گتھیاں ہی نہیں سلجھاتی بلکہ وہاں کی اردو صحافت پر ایک بھرپور تبصرہ بھی کرتی ہے اور سیاست کی اندرون خانہ عیاریوں ومکاریوں سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔ البتہ اس میں بعض مقامات پر جملوں کی تکرار ہے اور پروفنگ کی اغلاط بھی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود اس کتاب کی

معنویت کم نہیں ہوتی اور اگر موجودہ دور کے صحافی اس کا مطالعہ کریں تو ان کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ یہ صرف اردو صحافیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی معلومات افزا کتاب ہے۔

(قومی آواز، دہلی، ۲۶ر نومبر ۲۰۰۶ء)

◈◈◈

ایک فریادی دستاویز

سعید سہروردی

جب آپ کی نظر سے کوئی ایسی کتاب گزرے جو الگ ہو، امتیازی ہو تو اس کے بارے میں لکھنا عصری فریضہ بن جاتا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کی تازہ ترین کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' اس معاملے میں منفرد ہے۔ یہ مشرقی ہند کے ایک بڑے مرکز میں اردو صحافت کی آزادی کے بعد کی جدو جہد کی سرگزشت ہے۔

یہ کتاب بہ یک وقت خودنوشت ہے، تاریخ ہے اور صحافت پر تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب کا عنوان مشہور ادیب اور نقّاد اور فروغ اردو کونسل کے وائس چیئرمین شمس الرحمٰن فاروقی نے طے کیا تھا۔ اگر کتاب ان کی ذات (مصنف) کے ارد گرد گھومتی ہے تو رضوان اللہ صاحب کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ 'میں' تحریر کی دنیا میں ایک بہت بڑا اگڑھا ہے جس میں بڑے بڑے شہسوار گر جاتے ہیں، خدا کا شکر ہے رضوان صاحب اس 'پلِ صراط' سے بچ کر نکل گئے۔ وہ اپنی ذات کو صرف موضوع کی حدود کے اندر سامنے لائے ہیں۔

کافی عبرت آموز تجربات کے بعد رضوان اللہ کو امریکن سنٹر دہلی، میں 'اردو ایڈیٹر' کی جگہ ملی۔ اس وقت تک صحافت میں ان کے بال و پر جل چکے تھے۔ صحافت سے جو دل لگا

لیتا ہے وہ اس عشق سے آزاد نہیں ہوتا۔ اسی دل گرفتگی کی روئداد ہے' کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' انھوں نے یہ وضاحت کردی ہے۔ ''جن حالات اور واقعات کا میں تذکرہ کررہا ہوں، انھیں میں نے جس طرح دیکھا، برتا اور سمجھا اسی طرح بے لاگ بیان کررہا ہوں۔''

کہتے ہیں دیدۂ بینا قطرے میں دجلہ دیکھ لیتی ہے۔ رضوان صاحب نے بھی اپنی ذات کو اسٹیج یا اسکرین بنا کر نہ صرف کلکتہ کی صحافت کو، بلکہ اردو صحافت کو آئینہ دکھایا ہے۔ یہ جائزہ اس معنی میں جامع ہے۔ اس میں کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ صرف صحافت کے پیشہ ورانہ مسائل تک نظر محدود نہیں رکھی گئی ہے۔ اس کے انتظامی، کاروباری، تکنیکی اور مالکانہ پہلو کو بھی دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو صحافت کے سلسلے میں یہ ساری باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

صحافت میں داخل ہونے کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے ''میں ۱۹۵۱ء میں سائیکالوجی (نفسیات) میں ایم ایس سی کرنے کی غرض سے کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں داخلے کا فارم جمع کرنے آیا تھا۔ میں نئے ہندوستان کی سیاست سے نابلد، یہ سمجھنے کو تیار نہ تھا کہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے یا بنگال میں غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے، اس شہر میں ناپسندیدہ ہوسکتا ہوں۔ نتیجے کا انتظار کرتا رہا جو میرے علاوہ ہر سمجھدار پر عیاں تھا لیکن کسی مایوسی میں مبتلا ہونے کے بجائے اس فکر میں مبتلا ہوگیا کہ اگلے برس پھر کوشش کرنے تک ایک سال کا کیا مصرف لیا جائے؟ یہی وہ فکر تھی جو مجھے 'عصرِ جدید' تک لے گئی۔''

یہ اتفاق ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ نہ وہ اردو صحافت کو زندگی سے الگ کرسکے، نہ کلکتہ کو۔ کلکتہ سے تعلق کے بارے میں ان کی مثنوی 'اوراقِ مصور' (۲۰۰۲ء) اس کا ثبوت ہے۔ میرؔ نے دہلی کے گلی کوچوں میں اوراقِ مصور دیکھے تھے، وہی بات رضوان اللہ نے کلکتہ کے بارے میں دیکھی اور محسوس کی ہے۔ اس سے پہلے ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'بے ادبیات' (۲۰۰۰ء) منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس وقت یہ اندازہ ہوا کہ

صحافت کے غلاف میں ادیب چھپا ہوا ہے۔

کتاب کا موضوع طے ہو جانے کے بعد انھوں نے اس کے حدود اربعہ اور عہد کے تعین میں تاخیر نہیں کی۔ یہ بات انھوں نے اختصار کے ساتھ واضح کر دی ہے۔''اس پوری داستان کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔یعنی پہلا پتھر کا دور جب لیتھو مشینیں اردو اخباروں کو زندگی کی بھیک دے رہی تھیں اور دوسرا نئی جست کا دور جب آفسٹ مشینوں نے تیز گام ہونے کے لیے حدی خوانی کی،اسی راہ کا اگلا پڑاؤ وہ ہے جہاں کمپیوٹر کمپوزنگ روایتی خوش نویسی سے ہم آغوش ہوئی۔اسی طرح اس کہانی کی ایک اور تقسیم ممکن ہے یعنی نصف اول کو کلکتہ میں 'آزاد ہند' اور 'عصرِ جدید' کی قیادت کا دور کہا جا سکتا ہے تو نصف ثانی کو 'اخبارِ مشرق' کی پیش رفت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔......اس کہانی کو اس میں شریک ایک کردار کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس اعتبار سے بھی کہانی کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔'ایک حصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک دوسرا، ۱۹۷۵ء سے جاری ہے۔۲۴-۲۵ برسوں پر محیط پہلے مرحلے کے دوران میں بذاتِ خود کلکتہ کی صحافت کی بساط پر موجود فعال اور سرگرم تھا۔اردو صحافت سے وابستگی کا دوسرا دور اس اعتبار سے عجیب وغریب ہے کہ میں امریکن سینٹر میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے کلکتہ کے اخباروں اور صحافیوں سے مستقل رابطہ میں تھا لیکن جائے وقوع پر عدم موجودگی کی وجہ سے اس رابطہ میں پہلی سے گہرائی نہ تھی۔'' پورے ملک کی اردو صحافت میں ایک بات مشترک ہے۔اتفاق سے امیدوار جس اخبار میں قدم رکھتا ہے، وہاں جس جگہ بیٹھ جاتا ہے، وہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔اردو کے صحافی کا خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا اخبار نکالے یا اخبار کا مالک بن جائے۔ وہ ضرور کوئی الہامی طاقت تھی، جس نے رضوان اللہ کو ایسی مہم جوئی سے محفوظ رکھا۔

کلکتہ کی اردو صحافت کو ملک کی سب سے زیادہ مظلوم صحافت کہہ سکتے ہیں۔

رضوان اللہ کے الفاظ میں ''کلکتہ کی اردو صحافت کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ یوں کہ اخبارات نکلتے ہیں اور اپنی توانائی اور بساط بھر چل کر دم توڑ دیتے ہیں۔'' آزادی کے بعد اسے کانگریسی حکومت نے نشانہ بنایا۔ اسے ملک کے بٹوارے کی صلیب اٹھانی پڑے۔ بنگال میں مسلم لیگ کا زور تھا۔'عصرِ جدید' ان کا ترجمان تھا۔ اتنی سی بات کلکتہ کے اردو صحافی کے 'مشکوک' ہونے کے لیے کافی تھی۔ بنگلہ دیش کی تحریک ایک بار پھر کلکتہ کی اردو صحافت کے لیے تازیانہ بن گئی۔ ڈھاکہ کے اردو اخبار بند ہونے کے بعد لوگ کلکتہ کے اردو اخباروں کی طرف دیکھنے لگے۔ رضوان اللہ کا ذاتی ربط 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' سے زیادہ رہا لیکن انھوں نے اپنے معاصر اخباروں اور صحافیوں کا ذکر ہمدردی اور غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے۔ جہاں انھیں تختۂ ستم بننا پڑا اس کے بیان میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کو خاکہ نگاری کا بھی سلیقہ ہے۔ یہ بات کتاب پڑھنے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے۔ اپنے ناخوشگوار تجربات کے باوجود وہ اردو زبان اور صحافت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ یہ بات انھوں نے واضح کردی ہے۔

''ہمیں اس بات میں کوئی عار نہیں کہ ہم نے صحافت کے اندھے کنویں میں جست لگادی تھی۔ حالات کار بڑے دشوار اور صبر آزما تھے۔ لکھنے لکھانے میں معاونت کے اسباب و وسائل بہت ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے اور مستقبل میں امید افزا امکانات بھی نہیں نظر آرہے تھے۔ اردو صحافت تو درکنار اردو زبان کا کوئی مستقبل نہیں نظر آرہا تھا لیکن اب حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اردو زبان اور اردو صحافت کا بھی روشن مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ تاہم چند باتیں صحافیوں کے لیے بہت ضروری ہیں، پہلے اردو صحافی ہرفن مولا ہوا کرتا تھا لیکن اب خصوصی مہارتوں کا زمانہ ہے، اس لیے ہر صحافی کے لیے لازم ہے کہ اپنے ذوق اور رجحانِ طبع کے مطابق کسی خاص شعبہ یا گوشے کا انتخاب کرے، مثلاً اقتصادی امور جس پر ہمارے اردو اخباروں میں لکھنے والوں کا قحط ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے آفاق روز

بروز پھیلتے جائیں گے، سیاسیات، قومی، بین الاقوامی، مزید براں اس کے علمی ونظریاتی اور تاریخی پہلوؤں سے بخوبی آگاہی اور غائر مطالعہ، اس کے بغیر اپنے پڑھنے والوں کو نہ تو آگاہی دی جاسکتی ہے اور نہ ہی مستقبل میں ان کی رہنمائی کی جاسکتی ہے، جو کہ صحافی کی اولین ذمہ داری ہے۔''

مغربی بنگال اردو اکادمی نے شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تصنیف 'بنگال میں اردو صحافت' کو رئیس احمد جعفری سے نظر ثانی کرانے کے بعد شائع کیا ہے۔ افسوس یہ کہ ابراہیم ہوشؔ کی خودنوشت روزانہ 'اقراء' میں قسط وار ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ رئیس الدین فریدی مرحوم ایڈیٹر 'روزانہ ہند کی خودنوشت' ۹۶-۱۹۹۵ء میں قسط وار شائع ہوئی۔ ان دونوں میں سے کسی کو کتابی صورت میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کہ فائلوں کو دیمک چاٹ لے، ان کا کتابی شکل میں آنا مناسب ہوگا۔ یہ کام فروغ اردو کونسل یا مغربی بنگال اردو اکادمی کو انجام دینا چاہیے۔

بہر حال رضوان اللہ کی کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' آزادی کے بعد بنگال میں اردو صحافت کے بارے میں ایک فریادی دستاویز ہے جو اردو کے مستقبل کے بارے میں سنجیدہ افراد کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرے گی۔

راشٹریہ سہارا، دہلی ۲۸/ جولائی، ۲۰۰۶ء

اعتماد، حیدرآباد، ۳۰/ جولائی ۲۰۰۶ء

اخبارِ مشرق، دہلی، ۶/ اگست ۲۰۰۶ء

◈◈◈

کلکتہ کی اردو صحافت

اشہر ہاشمی

''صحافت نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہو لیکن ایک فخر کا احساس ضرور دیا ہے۔''

[P135]

''عصرِ جدید میں ملازمت کے دوران میری شدید علالت پر کسی طرح کی ہمدردی یا اعانت تو دور کی بات ہے مجھ دھکا دینے کا وہی موزوں ترین موقع سمجھا گیا۔''[P140]

''1964 کے فسادات کے دوران عصرِ جدید والوں نے مجھے کرفیو پاس تک دینا مناسب نہیں سمجھا۔''[P140]

''150 روپئے تنخواہ متعین ہوئی اور چار کالم ترجمہ میرے ذمہ دیا گیا۔''[P131]

رضوان اللہ کی 216 صفحات پر مشتمل تازہ ترین تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں اس طرح کے جملے کثرت سے موجود ہیں جن میں ''کلکتہ''، ''صحافت'' اور ''میں'' تینوں کی جلوہ سامانی یکجا نمایاں نظر آتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع شدہ اس کتاب میں رضوان اللہ نے کلکتہ کی صحافت، اردو اخبارات میں صحافیوں اور غیر صحافی کارکنوں [کاتب، پروف ریڈر، منیجر] کی زندگی، قیام کلکتہ کے 25 برسوں کے دوران خود اپنی علمی، ادبی، تعلیمی، مجلسی، تخلیقی سرگرمیوں اور پیشہ ورانہ جدوجہد کی ایسی داستان بیان کی ہے جس سے بصیرت

تو حاصل ہوتی ہے، مسرت نہیں، کیوں کہ اس کتاب کا داخلی مزاج بہت کشیدہ ہے۔ ایسے واقعات بہت کم ہیں جن کو پڑھ کر فرحت کا احساس پیدا ہو۔

رضوان اللہ کی زبان کلکتہ کے بہت سارے نثر نگاروں کے مقابلے میں عمدہ، عیب سے پاک اور کہیں کہیں مزاح کا پہلو [جیسے قیصر شمیم اپنی مجلس صدارت کے ساتھ دہلی آئے] پیدا کرنے کی کوشش کے سبب دلچسپ ہے۔

رضوان اللہ نے ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں کرداروں اور تاریخوں کی صحت کے ساتھ ان 25 برسوں کی بہت سی وارداتوں کو دستاویز بند کیا ہے اس کے علاوہ 'خبر اور افواہ' 'اردو نیوز سروس'، '1975 میں اخبارات کی فہرست'، 'غلط بیانی سے انکار کی پاداش'، 'اداریئے'، 'رپورٹنگ'، 'مضمحل صحافت'، 'جرنلزم کورس'، 'پریس کمیشن کا قیام'، 'خلافت کمیٹی' جیسے عنوانات قائم کر کے بہت تفصیل سے قاری کے سامنے بہت کچھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور 1951 سے 1975 تک کی وارداتوں کو موضوع سخن بنایا ہے جس میں ان کا ''میں'' بھی ہے اور ''کلکتہ کی اردو صحافت'' بھی اور جتنا کچھ ضبطِ تحریر میں آیا وہ اس کا اعتراف کرانے کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے کلکتہ سے وابستہ اپنی تلخ، ناگوار اور تکلیف دہ یادوں کو نہ صرف 2006 میں ختم ہونے والے 31 برسوں تک اپنے حافظے کا اہم جز بنائے رکھا بلکہ ان کے بیان میں اظہار کی اس شدت کو بھی راہ پانے کا موقع دیا جس کی وجہ سے بعض واقعات کی قرأت کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے رونما ہوتا ہوا سا ہے۔ انہوں نے کچھ واقعات ایسے بھی بیان کئے ہیں جن کو پڑھتے وقت لگتا ہے ہم اس رونما ہوتے ہوئے واقعے کے درمیان سے کردار بن کر گزر رہے ہیں۔ [یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ جس 'عصرِ جدید' اخبار میں رضوان اللہ نے 18 سال گزارے ہیں وہاں مارچ 1973 میں پہنچ چکا تھا]۔

رضوان اللہ نے کلکتہ اور اردو صحافت کا 1975 تک کا بیان کیا ہے۔ 1975 کے بعد

سے اب تک بہت کچھ بدلا ہے۔ میں ان زینوں، کرسیوں اور آوازوں کو پہچانتا ہوں جن کا ذکر رضوان اللہ کی اس کتاب میں جابجا ہے لیکن یہ ایک سچ ہے کہ اب وہ زینے بدل چکے ہیں۔ میز، کرسیاں بھی بدلی ہیں اور آوازیں بھی بدلی ہیں۔ نہیں بدلا ہے تو کلکتہ کے اردو صحافیوں کا مقدر، جن کا رونا رضوان اللہ کی اس کتاب میں رویا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلکتہ کے اخبارات کا ذکر ان کے لیے اپنا لہو بہ رضا و رغبت جلانے والا کوئی شخص جب کرتا ہے تو اس کا لہجہ اتنا تلخ کیوں ہو جاتا ہے، جتنا کہ رضوان اللہ کا ہے؟ کیا کلکتہ کے اردو اخبارت سے وابستہ صحافیوں کی امنگیں ضرورت سے زیدہ بلند ہیں؟ یا ان اخبارات میں تنخواہوں اور سہولتوں کا نظام اپنے کارکنوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف سے غافل ہے؟

کتاب کمپیوٹر سے کمپوز کرائی گئی ہے، طباعت اور کاغذ ٹھیک ٹھاک ہے، سرورق کتاب کے عنوان سے مطابقت کرتا ہوا سا ہے۔ آخری صفحہ پر رضوان اللہ نے ایک پرانی تصویر شائع کر کے اس گزرے ہوئے وقت سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس کو اس کتاب کے اندر لفظوں میں جیا ہے۔ اور اس کتاب کا انتساب بھی معنی خیز ہے ''ان گمنام صحافیوں کے نام جن کا خون جگر شاہ سرخیوں کے کام آیا'' لیکن یہاں ایک سچ کا اعتراف ضروری ہے کہ رضوان اللہ نے 'عصرِ جدید' کے 18 سال سمیت کلکتہ میں جو 25 سال گزارے وہ سال ان کی ساری حیات پر محیط نہیں ہو سکے۔ وہ آج کارناموں سے پر ایک مطمئن اور آسودہ کیریئر مکمل کر کے سبکدوشی کی آرام دہ زندگی میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ 8 تصنیفات اور تراجم کی فہرست تو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہاں دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلکتہ کے اخبارات میں گزرے ہوئے سختی اور شدت کے 9000 دنوں میں فکر و عمل کی تہذیب و تنظیم غصہ اور ضد کا ثمرہ تو نہیں۔ ◈◈◈

(خبر دار جدید، دہلی، یکم تا ۱۵ ر اگست ۲۰۰۷ء / ماہنامہ آجکل، دہلی، اپریل ۲۰۰۷ء)

کلکتہ کی اردو صحافت اور میں

خاور حسن

اردو میں شعر کہنے اور شعری مجموعہ کی اشاعت کا رجحان زیادہ ہے۔ چنانچہ اردو میں کئی ایسے موضوعات ہیں جن پر کتابیں کم ہیں اور لکھنے والے بھی کم ہیں۔ ان موضوعات میں صحافت بھی شامل ہے۔

اردو صحافت پر کتابوں کے کم ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ کئی صحافی بھی اردو سے روزی روٹی حاصل کرنے کے باوجود اس بات کو مانتے ہیں کہ چونکہ اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے اس لیے اردو صحافت کا مستقبل بھی روشن نہیں ہو سکتا لیکن جو لوگ دل و جان سے صحافت سے وابستہ ہیں، باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اردو اگر کہیں مٹ رہی ہے تو کہیں بس بھی رہی ہے۔ آج برطانیہ جیسے ملک کی مقبول زبانوں میں اردو کا شمار ہوتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس سال جن 40 ہزار طلبہ نے برطانیہ میں کمیونٹی لینگویج میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں سب سے زیادہ 6000 کی تعداد اردو طلبہ کی ہے۔ تو یہ سب یوں ہی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں میں، جو باخبر ہیں اور واقعی صحافی ہیں مذکورہ کتاب کے مصنف رضوان اللہ کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے موضوع اورعنوان سے مصنف نے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اپنی بات کو بہتر اور موثر طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے موضوع کے خشک ہونے کے باوجود کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بوریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ پڑھتے ہوئے ایک نشست میں کتاب کو ختم کرنے کی خواہش میں شدت آتی چلی جاتی ہے اور یہ بات صاحب کتاب کے حق میں جاتی ہے۔

پوری کتاب کلکتہ میں اردو صحافت اور مصنف کی ذات پر مرکوز ہے لیکن کتاب اس طرح تحریر کی گئی ہے کہ اپنی بات بھی کہہ دی اور دوسروں کے استفادے کے لیے مواد بھی فراہم کرا دیا۔ ابواب اور پھر ضمنی سرخیوں میں موضوعات کو تقسیم کرکے یہ آسانی پیدا کردی ہے کہ قاری اپنی پسند کے مطابق موضوع کا انتخاب کرکے اس کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ کتاب میں ایسی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں جو نووارد صحافیوں کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں اگر وہ پوری توجہ سے مطالعہ کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں صحافت پر کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں ایسی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جو قاری کو ایک سمت دے سکیں اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ یہ کتاب خاص کر اردو کے صحافیوں میں مقبول ہوگی۔

انگریزی میں کتاب کے موضوع کی مناسبت سے قیمت ہوتی ہے کیوں کہ اس کی تیاری میں کتنا وقت اور سرمایہ خرچ ہوا ہے اس کا خیال بھی رکھا جاتا ہے لیکن اردو میں صرف صفحات کی مناسبت سے قیمت دیکھی جاتی ہے لیکن یہ مناسب نہیں اس لیے موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کی قیمت مناسب ہی ہے۔ کتاب کا سرورق بھی چوں کہ اچھا بن پڑا ہے اور چھپائی بھی بری نہیں اس لیے امید ہے، کتاب پسند کی جائے گی۔

(عالمی سہارا، ۲۹/جولائی ۲۰۰۶ء)

◈◈◈

تعارف: اوراقِ مصور

(جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی)

رضوان اللہ صاحب نے ایک طویل مثنوی اور دو مختصر نظموں کے اس مجموعہ کو ''اوراقِ مصور'' کا نام دیا ہے۔ عنوان میں جو غم آمیز اشاریت چھپی ہوئی ہے، اس سے قطعِ نظر، یہ اشعار ہمیں ایک ایسے باکمال مصور سے بھی متعارف کراتے ہیں جو رضوان اللہ صاحب کی شخصیت میں چھپا ہوا ہے اور جو لفظوں سے اثر انگیز تصویریں بنانے پر قادر ہے۔

رضوان اللہ صاحب کا تعلق ایک علم دوست گھرانے سے ہے۔ مشرقی یو پی کے گمنام قصبات کا ایک امتیاز جو انہیں معروف و ممتاز شہروں کے برابر کی حیثیت دیتا ہے، ان میں صدیوں کی پروردہ، نمو پذیر اور زندہ علمی اور ادبی روایتیں ہیں۔ رضوان صاحب کے شعور میں جو وسعت، نظر میں جو گہرائی اور زبان و بیان میں جو غیر معمولی ذہانت اور شائستگی جھلکتی ہے، انہی روایتوں کا عطیہ ہے۔ کچھ دنوں پہلے ان کی نثری تحریروں کا ایک مجموعہ ''بے ادبیات'' منظرِ عام پر آیا تھا۔ ان میں بصیرت کی جو پختگی اور طبیعت کی جو امنگ اور شگفتگی پڑھنے والے کو دکھائی دیتی ہے، یہ اشعار بھی ہمیں تاثر کی اسی سطح تک لے جاتے ہیں۔ لیکن ایک عنصر جو ان اشعار کو قدرے مختلف جمالیاتی ذائقے سے ہمکنار کرتا ہے، ان میں حزن و نشاط کی ملی جلی کیفیت ہے۔

رضوان اللہ صاحب کو نثر اور نظم دونوں کے اسالیب پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ''اوراقِ مصور'' کے ابتدائیے میں انھوں نے بظاہر جس تخلیقی بے نیازی کے ساتھ ان اشعار کے نزول کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں ایک دل آویز داستان کا حسن شامل ہے۔ مثنوی کی ہیئت اور اپنی نظم کے لیے اس ہیئت کے انتخاب پر انھوں نے جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے، اس سے شاعری کی فہم اور اسلوبِ شعر کے مضمرات سے رضوان اللہ صاحب کی گہری شناسائی اور آگاہی کا کچھ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جدید نظم کی تحریک کے ساتھ مثنوی کی ہیئت کو دوسری ہیئتوں کے مقابلے میں جو قبولیت ملی تھی، وہ محض اتفاقیہ تو نہیں تھی۔ چنانچہ رضوان اللہ صاحب نے بھی اس ہیئت کا انتخاب اس لیے کیا کہ بیان کے تسلسل اور خیال کے تسلسل میں ایک اندرونی ربط اور مناسبت پیدا ہو جائے۔

مثنوی کے فارم سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو اس طویل نظم کو ہم بیان کے ایک تدریجی سلسلے میں پروئے ہوئے کانتوز (Cantus) سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہر جزو اپنے آپ میں مکمل بھی ہے اور اپنے ماقبل اور مابعد سے مربوط بھی ہے۔ ظاہر ہے ہر بیانیہ نظم کسی نہ کسی منصوبے کی پابند ہوتی ہے اور اس میں کام آنے والے تمام شعروں کی فنی اور فکری سطح ایک نہیں ہوتی۔ اس مجموعے کے سب شعر بھی ہم پلہ نہیں ہیں۔ کہیں کہیں بیان سپاٹ اور یک سطحی ہو گیا ہے۔ اس کیفیت سے اردو کی اعلیٰ ترین بیانیہ نظمیں بھی خالی نہیں ہیں۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ سیدھے سادے، بظاہر بے رنگ بیان کے دوران کہیں کہیں غیر معمولی تخلیقی استعداد اور ادراک کے شرارے بھی چمک اٹھتے ہیں اور ایسے اشعار بھی سامنے آ جاتے ہیں جن میں خیال کے ساتھ ساتھ شاعری کا بے پایاں لطف بھی موجود ہے۔

دلّی سے متعلق نظموں کے تذکرے میں رضوان اللہ نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان پر اس شہرِ خوبی کا قرض اتارنا ابھی باقی ہے۔ پتہ نہیں اس قرض کی ادائیگی کے لیے وہ بیان کا کون سا طریقہ اختیار کریں گے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انھیں اب کے آٹھ شہروں

کے اس شہر کی ایک داستان مرتب کرنی چاہیے۔ اس کتاب کے ابتدائیے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے باطن میں ایک حساس شاعر کے علاوہ ایک باکمال قصہ گو بھی چھپا ہوا ہے۔ اب میں اس کے ظہور کا منتظر ہوں۔

شمیم حنفی
۶/جون ۲۰۰۲ء

۱۱۴، ذاکر باغ
اوکھلا روڈ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

◈◈◈

مقدمہ

از پروفیسر شمیم حنفی
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اس مختصر سی دلچسپی اور ذہین بصیرتوں سے بھری ہوئی کتاب میں مصنف کی اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ اس عہد کے مسئلوں کی تصویر بھی جس طرح ابھرتی ہے، بدقسمتی سے وہ سطح بہت عام نہیں ہے۔ زندگی کے سنجیدہ معاملات پر شگفتہ تحریریں یا تو بے مزہ اور مرجھائی ہوئی ہوتی ہیں یا پھر ان میں زبردستی کا مزاح پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ اکثر خراب ہوتا ہے۔ ابتذال آمیز باتیں، باسی فقرے، بے رونق لطیفے، نہایت پر تصنع قسم کا اسلوب، غرض کہ اخبارات، رسائل اور کتابوں میں جن تحریروں کو طنز و مزاح کا نام دیا جاتا ہے انہیں آسانی سے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صورت حال عبرت ناک بھی ہے اور تشویش ناک بھی۔ خاص کر اس لیے کہ اردو صحافت اور ادب کے مشاہیر میں اعلیٰ درجہ کی شگفتہ اور شائستہ نثر لکھنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں طنز و مزاح کا سرمایہ بہت وقیع ہے۔ اسی لیے موجودہ صورتحال ہمیں پریشان کرتی ہے کہ اب ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت یا تو بارہا کے سنے ہوئے لطیفوں کا سہارا لیتی ہے یا پھر ''مزاح کی سنجیدگی'' کے اس شعور سے یکسر

بے گانہ ہے جس کی نشاندہی غالبؔ نے ان لفظوں میں کی تھی کہ ''دل محیط گریہ ولب آشنائے خندہ ہے!''

رضوان اللہ صاحب اپنے میلانِ طبع کے لحاظ سے صحافی ہیں، ادیب نہیں۔ مگر ان کا شعور اس روایت میں پیوست ہے جہاں ادب اور صحافت میں لاگ کا نہیں بلکہ لگاؤ کا رشتہ تھا۔ اس روایت کے سائے میں صحافت نے ادب کی دنیا میں بھی اعتبار قائم کیا۔ کیسے کیسے جلیل القدر صحافی سامنے آئے جو ادبی حلقوں میں جانے پہچانے اور مانے جاتے تھے۔ نثر اور نظم کی کئی صنفوں میں ان کی بصیرتوں کے چراغ آج بھی روشن ہیں۔ رضوان صاحب کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ مگر ان کا جوہر بالعموم نثر میں ہی کھلتا ہے۔ البتہ ایک بات جو ان کی نظم اور نثر میں مشترک ہے، وہ ہے روایتی اسالیب پر ان کی ماہرانہ گرفت۔ مثنوی اور قصیدے کے انداز میں بھی انھوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی شگفتہ طبعی کا اظہار کیا ہے۔ ظفر علی خاں، اقبال سہیل، رئیس امروہوی کی یادیں بعض اوقات رضوان صاحب کے اشعار سنتے وقت تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے خاص بات یہی ہے کہ وہ شعر یا نثر کے اسلوب کو کبھی بھی مقصود بالذات نہیں بناتے۔ ان کی نظر ہمیشہ اپنے نشانے پر ٹکی رہتی ہے۔ اور ان کا نشانہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جس کی روایت اردو میں انیسویں صدی کے دوران حلقۂ اودھ پنچ نے قائم کی تھی اور جسے ترقی دی بیسویں صدی کے ربع اول کی صحافت نے۔ اس روایت کے مطابق صحافی اپنے معاشرے اور اپنے عہد کا ضمیر ہوتا تھا، جو اپنے آپ میں گم ہونے کے بجائے اپنے ماحول کے احتساب کی خاطر ہمیشہ بیدار رہتا تھا اور گرد و پیش کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ عام انسانوں کی زندگی پر جو باتیں اثر ڈالتی ہیں، انہیں سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی دھن میں رہتا تھا۔ وہ ایک بنتی ہوئی دنیا، دوسرے لفظوں میں اپنے حال کا مؤرخ اور مفسر ہوتا تھا۔

ایسا نہیں کہ ہمارے زمانے میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہو، مگر اب صحافت نے دنیا داری

کے طریقے اپنا لیے ہیں یا پھر یہ کہ اکثر ''بگڑا ہوا ادیب'' صحافت کے میدان میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہتا ہے۔ ''بگڑا ہوا ادیب'' ہم نے اس لیے کہا کہ اب اردو اخباروں میں صاف ستھری، رواں دواں اور شگفتہ نثر لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے چلن نے لسانی سطح پر اردو صحافت کی بنیادیں کمزور کردیں۔ اردو کی طرف سے حکومتوں کی بے توجہی نے سب سے زیادہ نقصان اردو صحافت کو پہنچایا۔ اس حوصلہ شکن ماحول میں رضوان صاحب کا انگریزی میں اظہار پر قادر ہوتے ہوئے بھی اردو صحافت کو گلے سے لگائے رکھنا دراصل ان کے عشق کا (اور خسارے کا) سودا ہے۔

اس کتاب کے مضامین اخباروں کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان کی ایک خوبی ان کے موضوعات کی وسعت اور ان کا تنوع ہے۔ دوسری خوبی ان کا ستھرا، شگفتہ، جاندار اسلوب ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی وہ گہرا، معنی سے معمور اور منور انسانی عنصر ہے جس نے ان مضامین کو سنجیدہ مطالعے کی چیز بنا دیا ہے۔

رضوان صاحب ایک گوشہ گیر، شہرت اور توجہ کی دھوپ سے گھبرانے والے، کہنہ مشق صحافی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کے نقوش پچھلے پچاس برسوں کی اردو صحافت پر ثبت ہیں۔ اس لیے یہ چند سطریں تعارف کے بجائے دراصل اعتراف کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے ہوش مند اور باخبر قاری اس اعتراف میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔

شمیم حنفی

دہلی، ۱۴؍ستمبر ۱۹۹۹ء

◈◈◈

اوراقِ مصور۔ بے ادبیات

میری دو تصنیفات ''بے ادبیات'' اور ''اوراقِ مُصوّر'' پر مختلف تبصرے شائع ہوئے لیکن دوستوں نے ایک اور راہ اختیار کی یعنی ان دونوں تصنیفات کا بیک وقت تعارف کرانے کے لیے غالب اکاڈمی، بستی نظام الدین، نئی دہلی میں ایک مجلس کا اہتمام کر ڈالا۔ ۱۲/اپریل ۲۰۰۳ء کو منعقد ہونے والی اس مجلس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ خاصے طویل اور تفصیلی تھے۔ فی الحال انہی مضامین کے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

پہلی تصنیف تو ''بے ادبیات'' ہے جس کی اشاعت نے ایسا تاثر چھوڑا جو میری غرض و غایت نہ تھی۔ میں صرف بعض سماجی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا لیکن اس آئینے میں مجھے خود اپنا چہرہ ٹیڑھا نظر آنے لگا۔ پھر اس شبیہ کی اصلاح کی غرض سے اگلی تصنیف ''اوراق مصور'' کو منظر عام پر لایا۔ ذیل میں ان دونوں تبصروں کے درمیان ربط برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

''اوراق مصور''

ہمارے تہذیبی استعارے جو شہروں کی شکل میں ابھرتے تھے وہ سب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ذہنی افق سے ہمارے تہذیبی حوالے منہدم ہوتے جا رہے

ہیں۔ اصفہان، شیراز، سمرقند، بخارا یہ سب ہماری تہذیب کے گہوارے اور استعارے تھے۔ ان شہروں کی تہذیب میں ہماری تہذیب زندہ تھی اور ان کی موت سے ہماری تہذیب پر مرگ طاری ہوا۔

شہر شناسی ایک بہت بڑا فن ہے۔ ہمارے عرب مورخین نے شہر نگاری کی ایک اچھی روایت قائم کی۔ رضوان اللہ صاحب نے ''اوراقِ مصور'' میں دراصل اس شہر کے ایک ایک منظر نامے کو حیاتِ نو عطا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ہندوستان کی سانسوں میں دھڑکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مثنوی کی صنف کا سہارا لیا ہے۔ مثنوی کا مروجہ فارم کیا ہے یا اس کی ہیئت کیا ہے اس بحث سے قطع نظر رضوان اللہ کی مثنوی اپنے مفاہیم اور معانی کی ترسیل میں مکمل طور سے کامیاب ہے۔

رضوان اللہ صاحب کی اس مثنوی میں صرف تاریخیت نہیں ہے بلکہ ایک پراسرار شمولیت بھی ہے۔ جب شہر کی سانس میں اپنی سانس شامل ہو جائے تو پھر شہر، آدمی کی سانسوں کی طرح دھڑکنے اور مہکنے لگتا ہے۔ کلکتہ شہر کی شناخت میں اپنی شمولیت رضوان اللہ صاحب نے کمال ہنر مندی سے دکھائی ہے۔ اسی طرح ان کا دلی نامہ محض دلی کا ایک منظر نامہ نہیں ہے بلکہ دلی نامہ اور مثنوی کلکتہ میں ان کے دل کی دھڑکنیں ہیں جن میں بہت سے معانی اور مفاہیم مضمر ہیں جن کی تفہیم وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جائے گی۔ ''اوراقِ مصور'' کلکتہ کا کولاژ ہے اور اس میں شبدوں سے جو چتر کاری کی گئی ہے وہ تصویریں نہایت حسین ہیں۔ اس میں فکر و معانی اور لفظیات کا حسن سمٹ آیا ہے۔

دراصل میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ آج اس دور میں رضوان اللہ کا دم غنیمت ہے کہ وہ زبان و بیان پر مکمل قدرت بھی رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں معلومات سے بھرپور بھی ہیں۔ وہ ایک صاحبِ کمال شاعر بھی ہیں اور طنز نگار بھی اور اس علمی روایت سے وابستہ ہیں جو ان دنوں معدوم ہوتی جاتی ہے۔ آج زوال کا عروج ہے۔ اس لیے اس انبوہِ زوال

پرستاں میں یہ کتاب کھو جائے گی مگر آنے والا زمانہ یقیناً ''اوراقِ مصور'' کے حوالے سے نیا ڈسکورس قائم کرے گا تب اس میں مضمر معلومات کا سمندر لوگوں کو مبہوت اور متحیر کرے گا۔ ''اوراقِ مصور'' میں عرفان و آگہی کی شمع روشن ہے۔ (حقانی القاسمی)

☆☆

مہاجروں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جو شہر ان کے لیے تقویت اور تحفظ آسانی سے فراہم کرتا ہو وہ اسی کے ہو جاتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب نے بے وطنی اور وطنیت کے حوالے سے بحث کر کے اس کلیے کو غلط ثابت کرتے ہوئے اس سچائی پر ہم لوگوں کا یقین پھر مستحکم کیا ہے کہ جس شہر میں فکر و نظر نے آنکھیں کھولی ہوں وہی شہر پوری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے۔

''اوراقِ مصور'' کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوا کہ رضوان اللہ علمی صاحب کلکتہ کی ہر سڑک پر، ہر بھیڑ میں ہر تجربے میں، ہر مرحلے میں میرے ساتھ اور میری عمر کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ، جن کی کن پٹیوں کے بال اب سفید ہو رہے ہیں، موجود تھے.....اپنے اس دور کے لوگوں کے احساسات اور جذبات میں نہ صرف بے تکلفی سے حصہ دار بنے بلکہ ان تمام چیزوں کو اپنے حافظہ کا حصہ بنایا اور اب ایک مربوط فکر کی صورت میں اسے اظہار کا پیرایہ بھی عطا کیا۔

اس کتاب کے تعارف میں ممتاز اور محترم نقاد شمیم حنفی نے لکھا ہے ''رضوان اللہ صاحب نے ایک طویل مثنوی اور دو مختصر نظموں کے اس مجموعہ کو ''اوراقِ مصور'' کا نام دیا ہے۔ رضوان صاحب کے شعور میں جو وسعت، نظر میں جو گہرائی اور زبان و بیان میں جو غیر معمولی ذہانت اور شائستگی جھلکتی ہے۔ انہی روایتوں کا عطیہ ہے۔ مثنوی کے فارم سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو اس طویل نظم کو ہم بیان کے ایک تدریجی سلسلے میں پروئے ہوئے کانتوز سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہر جز و اپنے آپ میں مکمل بھی ہے اور اپنے ماقبل اور سابقہ سے

مربوط بھی ہے۔''

اس طرح کی طویل نظم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ رضوان صاحب نے مثنوی جیسی صنف کا سہارا لیا۔ اس کے تقاضے بھی انھوں نے اسی دیانت داری سے پورے کیے جس دیانتداری سے پہلے صحافت کے تقاضے نبھارہے تھے اور اب ادب کے تقاضے نبھارہے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ کوئی شخص تین دہائیوں کی دوری پر کھڑا ہو کر کلکتہ کو دیکھنے اور دکھانے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کررہا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کلکتہ میں رچے بسے ہیں اور کلکتہ رضوان صاحب میں رچا بسا ہے۔ فکری سطح پر ایسا ادغام دیکھنے کو نہیں ملا۔ (اشہر ہاشمی)

☆☆

''اوراقِ مصور'' دراصل ایک مثنوی ہے جس میں کلکتہ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے آپ (رضوان اللہ) نے کلکتہ میں ۲۷ رقیمتی سال گزارے ہیں اس لیے آپ نے کلکتہ کی تاریخ منظوم کرنے کو اپنے اوپر فرض کرلیا تھا، اسی فرض اور قرض کی ادائیگی کا عملی نمونہ ہے ''اوراقِ مصور''۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے جنھوں نے کلکتہ نہیں دیکھا ہے یہ کتاب ایک بائیسکوپ کی مانند ہے جو ہمیں اس شہر کی ایک جھلک دکھا کر اس کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔

''اوراقِ مصور'' میں کلکتہ کی تاسیس، وہاں کی سرکردہ شخصیات، مشاعرے صحافتی خدمات، قحط بنگال، ۱۹۴۶ء کے فسادات، تقسیم بنگال، نکسلی تحریک کلکتہ میں ہونے والی ہڑتالیں، وہاں کا کلچر اور پھر وہاں کے معروف مقامات، کیا کچھ نہیں ہے اس کتاب میں۔

''اوراقِ مصور'' کے مطالعہ کے وقت کہیں نظیر اکبرآبادی یاد آجاتے ہیں تو کہیں ڈاکٹر اقبال لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رضوان اللہ صاحب کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے۔ ان کے قلم کی انفرادیت پوری کتاب میں جلوہ گر ہے، مثنوی کے پیرائے میں اپنے احساسات کو پیش کیا ہے۔ (سہیل انجم)

☆☆

بے ادبیات:

میں سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاروں کے پاس ایک ایسا آئینہ ضرور ہوتا ہے جس میں وہ مستقبل کے منظر نامے کو محسوس کرتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب بھی بنیادی طور پر طنز ومزاح کے آدمی ہیں، میرا خیال ہے کہ مزاح وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے پاس دنیا بھر کی معلومات اور اطلاعات کا وافر ذخیرہ ہو۔ مزاح کی ایک ایک سطر میں معلومات کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ مزاح اور معلومات کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ مزاح کے لیے جس شارپنس، جس قادر الکلامی، جس طباعی اور خلاقی کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی اور چیز کے لیے نہیں پڑتی......مزاح کی چند سطریں لکھنا اوران سطروں میں سمندر کو کوزے میں قید کر کے قاری کو باندھ لینا جوئے شیر لانے جیسا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے مزاح میں سب سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔

میں مزاح میں جتنی سنجیدگی اور وقار محسوس کرتا ہوں اتنی تو تنقید کی سنجیدہ تحریروں میں بھی نظر نہیں آتی۔ مزاح کے لیے پورے وجود کی بیداری ضروری ہوتی ہے۔ حواس جب مکمل طور پر جاگتے ہیں تبھی مزاح معرضِ وجود میں آتا ہے۔ رضوان اللہ صاحب کے اندر یہ خوبی ہے کہ ان کے سارے حواس بیدار ہیں، ان کی آنکھیں چاروں دِشاؤں میں شنکر کی طرح پھیل ہوئی ہیں جو تمام منظر نامے کا مکمل احاطہ کر لیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رضوان صاحب نے طنز ومزاح کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ آج کا بے حس، بے خبر اور اقربا پرور، گروہ بند ادبی حلقہ شاید ان کی عظمت کا اعتراف نہ کرے مگر آنے والے زمانے میں جب یہ ساری خرافات، واہیات نیست ونابود ہو جائیں گی اور ایک نیا ادبی منظر نامہ تشکیل پائے گا تو ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا اور یہ بالکل مبالغہ نہیں بلکہ بالکل سچی بات ہے۔ مزاح میں جس علوئے ذہنی اور ارتفاعِ فکری اور نشاطِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بدرجۂ اتم رضوان اللہ صاحب میں موجو ہے۔ ان کی تحریر میں ایک تیر نیم کش کی سی کیفیت ہے جسے پڑھنے کے بعد آدمی مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ (حقانی القاسمی)

☆☆

''بے ادابیات'' اور ''اوراقِ مصور'' رضوان اللہ صاحب کی شخصیت کے دو بالکل متضاد پہلو ہیں۔ایک میں طنز ومزاح کا اعلیٰ نمونہ دوسرے میں سنجیدہ شاعری کی جادو بیانی۔ جنھوں نے صرف ''بے ادبیات'' کا مطالعہ کیا ہے انہیں بھی میری طرح یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ آنجناب لطیف اور باریک پیرائے میں جتنا گہرا طنز کرتے ہیں سنجیدہ شاعری میں بھی اپنی شخصیت کی اتنی ہی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں اور شاعری کے ذریعہ طنز مزاح کے نشتر لگانے کے ساتھ ساتھ اپنی نثری تحریروں سے بھی سماجی برائیوں کا اس انداز سے آپریشن کرتے ہوں کہ آپریشن کرانے والا ہنسی خوشی اس کو جھیل جائے۔　(سہیل انجم)

☆☆

اپنی ساری عمر صحافت کے پیشے میں گزارنے کے دوران اہلِ دنیا کا تماشہ دیکھنے اور آس پاس کے لوگوں کے رویوں سے زخمی ہونے کی وجہ سے کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے یا دل کا غبار نکالنے کی خاطر رضوان اللہ صاحب طنزیہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے۔لیکن انہیں شائع کرانے سے گریز کرتے رہے۔وہ بہترین شاعر اور بہترین نثر نگار بھی ہیں، اور ان کی شاعری اور نثر کا شاہکار بھی اس مجموعہ مضامین اور نظم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔اس مجموعے میں نثر پاروں کو انہوں نے ''بے ادبیات'' کا عنوان دیا ہے اور اس کے تحت ۲۶ مختلف مضامین شامل ہیں۔ چند مضامین کے عنوان اس طرح ہیں: ایک بکرے میں دوقربانی، پیٹنٹ کرالو، جہیز، کمزوریوں کا شرطیہ علاج، دعوتِ افطار، ری سائیکلنگ، فرنچ کٹ تعلیم اور سندباد کا آخری سفر۔

اسی طرح طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا عنوان ''بدنظمیاں'' ہے۔غزلیات کے تحت زیادہ تر پرانے شعراء کی غزلوں کی مزاحیہ تضمین کی ہے۔ایک خاص بات یہ ہے کہ ہمارے بعض

کالم نویس مزاح نگاروں کی طرح انھوں نے واقعات اور چٹکلوں کا سہارا لے کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کا ہر جملہ اپنے آپ میں ایک ایسی طنزیہ کاٹ رکھتا ہے جو قاری کو جھنجھوڑ بھی دیتی ہے اور زیرلب مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔

پیش لفظ شمیم حنفی کا لکھا ہوا ہے لیکن یہاں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ آخر میں اعمال نامہ کے تحت اپنی زندگی کے کوائف بھی دیئے ہیں۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے اور اردو کے ہر قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ (م۔ر۔ف)

◈◈◈

تبصرہ: ہمارے گاؤں ہمارے لوگ

کتاب کا نام	:	ہمارے گاؤں ہمارے لوگ
مصنف	:	رضوان اللہ
مبصر	:	ڈاکٹر زہرہ فاروقی

رضوان اللہ صاحب کی ادبی کاوشوں کے سلسلے میں یہ تازہ ترین تصنیف ہے۔ کتاب کے ٹائٹل ہی سے اس کی نوعیت کا اندازہ ہوجاتا ہے لیکن کتاب کھولتے ہی انتساب اور فارسی قطعات سے یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ زندگی کا بڑا حصہ کلکتہ اور دہلی جیسے پرہجوم شہروں میں گزارنے کے باوجود موصوف کا روحانی وجود اب بھی پرانی بستیوں میں ہے۔ حافظ شیرازی کا کہنا تھا کہ ''کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ'' کا لطف تو جنت میں بھی نہیں ملنے کا اور رضوان صاحب اپنے فارسی قطعہ میں ''دیہہ و دہقان'' کو اپنا ماضی بیان کرتے ہوئے انھی کو اپنا ''روم و شیراز و اصفہان'' قرار دیتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے بزرگوں سے عقیدت کا اظہار اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کی ایک کوشش کے علاوہ وطن سے ان کی بے پناہ محبت کی غماز ہے۔ وہاں کے معمولی سے معمولی فرد، تمام واقعات و کوائف کو جس طرح

انھوں نے پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب ان کے ذہن پر نقش ہی نہیں ہیں بلکہ دنیا پر منکشف ہونے کے لیے کسی مناسب موقع کے منتظر بھی رہے ہیں۔

اعظم گڑھ دراصل صرف ایک شہر یا ضلع نہیں بلکہ ایک خطہ ہے جہاں کے گاؤں اور قصبات کی مٹی ذہانتوں کے لیے بے مثال حد تک زرخیز ہے وہاں کے زائیدہ و پروردہ ذہنوں کی دنیائے ادب پر ضیا پاشیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ رضوان اللہ صاحب بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ صحافت کا میدان ہی ان کی زندگی کی جولان گاہ رہا ہے لیکن ان کی ادبی نگارشات بھی خاصی وقیع ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف پختہ اور رواں زبان اور اپنی بات کہنے کے ایک منفرد سلیقے اور طرزِ بیان کی مثال ہے۔ کتاب میں مذکور شخصیات کے تذکرے ایک طرح کے خاکے ہیں لیکن راوی اول کے اندازِ بیان کے علاوہ ان میں حقیقت نگاری کا لطف بھی ہے۔ گاؤں کی منظر نگاری کے لیے اپنے دو گاؤں کا انتخاب ان سے جذباتی تعلق کا اظہار تو ہے ہی گاؤں کے لوگوں میں خلوص اور اپنائیت کے خواص کی طرف اشارہ بھی ہے جو شہری زندگی میں مفقود ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اس بات کی تحریک بھی ہے کہ لکھنے والے اپنے اسلاف اور اپنی بستیوں کی تاریخ رقم کریں جو زمانے کی گرد کی دبیز تہہ کے نیچے گم ہوتی جارہی ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک نظم ''سمبھی نامہ'' رضوان صاحب کے ننیہال سے ان کے دلی تعلق کا مظہر ہونے کے علاوہ سادہ اور سلیس زبان میں شعر گوئی میں ان کی مہارت کی بھی مظہر ہے۔ کتاب کا ٹائٹل ایک دیہی منظر پیش کرتا ہے۔ طباعت نہایت عمدہ اور دبیز کاغذ پر ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب پڑھنے والوں میں اپنے ماضی کی بھی کچھ یادیں تازہ کردے۔

کتاب D-178، ابوالفضل انکلیو کے علاوہ نئی کتاب پبلشرز، اوکھلا، نئی دہلی-۲۵ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر زہرہ فاروقی

شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Author's Version

A huge amount of literature in various languages, European, Asian and Indian, has been translated in Urdu during the course of past decades and centuries, but the masterpieces in Urdu have not been translated in other languages to that extent, nowhere in comparison to that. That realization was pricking my mind for some time. Individual efforts have been made by scholars here and there to translate Urdu works in other languages, but to my knowledge no concerted or institutionalized and organized effort has been made so far in that direction.

This prompted me to think about doing something whatever was possible within my limited capacity and capability. Obvious next step was to pick my small and simple poems and translate them in English. In due course it became what the Persian poet has said: "Dameed dana-o-baleed-o- ashian gah gasht".

"The grain grew and continued to grow and became a nesting place."

Thus the accumulated translations took a book form. But there lies much beyond this book which must be done. Our Urdu academies, Urdu departments in universities and other organizations have been doing good jobs in teaching and propagating Urdu but not much have been done in the area I have visualized. We, all concerned should start some organized and institutionalized effort in the required direction without losing any more time. I hope and wish that The Milli Gazette would prove and provide a forum for such efforts and ideas would get wings at this nesting place.

As for the book "My Reflections" it is a collection of a little over fifty selected poems and ghazals reflecting personal ethos of the poet and his views on various manifestations in personal and social life. The translation in English makes it possible to share all that with a cross section of people speaking languages other than Urdu and at the same time to encourage all to dig into the treasures Urdu language has been hoarding and hiding for ages. This book is a sort of exhortation to others to break the inertia and come out with whatever presentable they possess. This will be a service to the language and the colourful culture it represents.

Faruqi

"I like the idea of Urdu poems appearing with their English translations which have been made by the author himself. The Urdu poems are quite good, if somewhat simple but the English translations

are generally excellent, certainly better than anything I have seen recently."

"I suggest that Mr. Rizwan Ullah append his surname 'Farooqi' because then we'll all be connected with him immediately as one of our own widespread clan."

Shamsur Rahman Faruqi

Posted at 11.30 AM on July 29, 2011

Zahir Anwar

I have gone through the original and translated version of the poetic compositions of Mr. Rizwanullah sahib.

At the outset I must confess that I am neither a poet nor a critic of stature and thus I am not in a position to pass a judgment on the comparative merits of the original poems and translations. I can only give my humble opinion as a reader and say with some confidence that the creative energy in the original Urdu verses and the genuine effort of the poet himself to convey the meaning and essence of the original in English language are commendable and touched me.

The poems and ghazals are simple, true to the spirit of the subject matter and at times exquisite in effect. Durga Puja and Calcutta are fine poems and portrayed with certain warmth of feelings. The ghazal in tune with the musical strain of the inimitable Amir Khusru is more than satisfactory in the original.

Translating poetry, even by poets themselves, is a tough job. It calls for an expertise and command of the languages involved. Both

authenticity and artistic integrity are of paramount importance. There is always a very thin line between a near-perfect translation of a poem and a poor one. The perfect transmission of emotion and genuine linguistic authenticity should be the criterion of genuine literary translations.

The poet has succeeded considerably in translating the spirit and meaning of his own verses. The emotions, too, are conveyed admirably to the readers. Although at times one tends to feel that these are mostly exact translations of the Urdu poetry and hence straight forward, there is inherent cadence in the diction. Simple language is used instead of high-flown expressions. Perfect words seem to have been found in perfect order. However there is always room for improvement and it is always nice to go back to the drafts again for some replacements here and there and make it more musical than prosaic translations. It remains the priority of the poet himself to find out where little bit of changes can make a world of differences.

Zahir Anwar, Calcutta

(This is only my humble opinion and may not be taken seriously.z.a)

ظہیر انور

جناب رضوان اللہ صاحب کی شاعری کے مختصر نمونے میرے سامنے ہیں، ان کے مطالعہ سے مجھے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا ہے کہ یہاں گہرے احساس اور جذبے کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ذاتی شعور کی شمولیت کا بھی احساس ہوا ہے۔ ان کے شعری تجربے، مناظر کی عکاسی اور منفرد آواز کی لہروں میں خالص شاعری کا

ایک در کھلا ملتا ہے جو قدیم و جدید اور مخصوص تحریک کی شاعری سے مختلف اور تازہ کاری کے وصف سے بھر پور ہے۔

ان کی نظمیں درگا پوجا، کلکتہ اور تقسیم اور اس کے بعد ایسی نظمیں ہیں جو منظر نگاری اور مخصوص شہر و حالات کی زائیدہ ہیں، اگرچہ وقت بدل گیا ہے، زمانے نے قیامت کی چال چلی ہے، شہر اور پوجا کا تصور اور اس کی صورتِ حال اور مناظر میں حد درجہ تبدیلی نے جنم لیا ہے، تاہم رضوان اللہ صاحب کی نظمیں ہمیں اپنی منظر نگاری، جذبے کی فراوانی اور آفاقی پہلوؤں سے متاثر کرتی ہیں۔ آج کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں کلکتہ اور درگا پوجا جذبے اور مناظر کی سچائی اور تصور کے acuteness کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے اشعار دیکھئے:

کوندا سا ہر طرف کو لپکتا ہے، دیکھئے
یا رب ہو خیر خرمنِ دل کی، بچایئے
(درگا پوجا)

ان کی یہ بت گری بھی عدیم المثال ہے
آذر ہیں اپنے وقت کے فن میں کمال ہے
(درگا پوجا)

یا پھر

اے کلکتہ! اے مخزن عرفان و آگہی
بانگ سروش ہے تری پل بھر کی خامشی
فکر رسا ہے تیری زمانے سے تیز تر
پہنائے ممکنات سے آگے تیری نظر

یوں لگتا ہے کہ شاعر کا مشاہدہ نہ صرف سچائی پر مبنی ہے بلکہ اپنی شاعری کی روایت

اور زبان کی نزاکت سے بھی شاعر کو گہری آگاہی ہے۔ یہ اشعار اپنی تمام تر سادگی میں ہمیں مسرت فراہم کرتے ہیں اور اپنے مشاہدے اور تجربے میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہاں شاعر کا جمالیاتی پہلو اور موضوعات سے گہرا شغف قاری کو شاعر کے تصور اور دل کی دھڑکن میں شامل کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظمیں ''تقسیم کے بعد'' اور ''بازیافت'' کو پڑھتے ہوئے موضوعات یا زبان کی پیچیدگیوں کو decode کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور الفاظ کے زیر و بم ہمارے دل کو چھو لیتے ہیں۔ تقسیمِ وطن پر ان کی نظم نہ صرف پُراثر ہے بلکہ ان کے تخلیقی اظہار کو نہایت دردمندی سے ہم آہنگ کر کے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ تقسیمِ وطن کے تاریخی تناظر میں زندگی کے مناظر الگ اور وسیع تناظر میں بدلے ہیں، اس بڑے حادثے نے زندگی کو نہ صرف تہہ و بالا کیا بلکہ بقول شاعر ''سروسمن کے سر سے قیامت گزر گئی'' کے سنگین کرب سے ہمارے شعور کو مہمیز کرتا ہے۔ جو دکھ اس حادثے نے دیا اس کا نہایت ہی پُراثر احساس ان کی اس نظم میں اجاگر ہوتا ہے۔ اگر چہ اس تاریخی تناظر میں زندگی کی پرانی اور اعلیٰ قدروں کی پائمالی بھی اہم قدر ہے، تاہم جس درد کو شاعر نے اپنی نظم میں سمیٹا ہے وہ ہمارے لیے اور ہمارے اجتماعی شعور کے لیے بڑا ہی رقّت انگیز تصور پیش کرتا ہے۔ اگر چہ مختلف شہروں اور گاؤں گاؤں میں اس تقسیم نے جو فساد برپا کیا اور جس طرح کی بے کلی کا احساس پایا گیا ہوگا، وہ بھی ایک اہم پہلو ہے۔ لیکن ان کی نظم نے جو تاثر قائم کیا ہے وہ گہرا اور دیرپا ہے اور انسانی وجود پر لگی ضرب کو بڑی تاثیر کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے:

صبح ظفر کی بات تھی، شام الم ملی
وہ کربلا سے کم تھی نہ کوفے سے کم ملی

ذاتی اور سیاسی پس منظر کا یہ بلیغ بیان شعری حوالے سے کم اہم بات نہیں۔ اسی طرح ان کی نظم ''بازیافت'' میں زبان اور مشاہدے کا حسن اور نظم کا باطنی آہنگ ایک تخلیقی

فنکار کا آہنگ اور احساس شعر و نغمہ کی صورت اختیار کر کے ہمیں بھی اپنے جلو میں لیے سفر کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل جو حضرت امیر خسرو کے لہجے اور ذہنی فضا میں تخلیق ہوئی ہے، کم متاثر کن نہیں ہے۔ زبان پر قدرت اور اردو فارسی شاعری کے تاریخی تناظر پر پوری گرفت کے بعد ہی ایسی غزل تخلیق ہوتی ہے۔ اس غزل کے ہر شعر میں ایک کیفیت اور مخصوص فضا کی شمولیت نے غزل کو حسن اور وقار عطا کیا ہے۔ خاص طور پر یہ دو اشعار دیکھئے:

شبِ تار جو کہ تھی ہمسفر کسی راستے میں بسر ہوئی
ہو بیانِ وحشتِ دل بھی کیا، جو گزر گئی سو گزر گئی
وہ دعا تھی میرے شکستہ دل کی جو سدرہ پر بھی نہ رک سکی
رہِ عرش اس کی نظر میں تھی، نہ ادھر گئی نہ اُدھر گئی

ان نظموں کے انگریزی ترجمے بھی خوب ہیں، اگرچہ شاعر کا کیا ہوا ترجمہ اکثر بہترین ترجمے کی صف میں نہیں بھی آ سکتا ہے، لیکن یہ ترجمے نظموں اور غزل کی روح تک پہنچنے کی بہترین کوششیں ہیں، کہیں کہیں لفظوں کے براہِ راست ترجمے کی بنا پر ایک گوشہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ (یہ میری ذاتی اور flawed رائے بھی ہو سکتی ہے)

ظہیر انور، کلکتہ

◈◈◈

”عکسِ خیال“ یا
درونِ ذات کے کرب کا اظہاریہ

سہیل انجم

ہماری صحافتی برادری کے بزرگ دانشور جناب رضوان اللہ صاحب سے تعلقِ خاطر کے ایک طویل عرصے پر جب میں اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوں تو چونک چونک جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دینا ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ وہ ہر دو چار مہینے پر یا سال چھ مہینے پر اپنی کسی نئی فکری کاوش سے حیران ضرور کر دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت بظاہر بہت سادہ مگر بہ باطن بہت تہہ دار ہے۔ کبھی ان کے پس پشت سے ایک صحافی جھانکنے لگتا ہے تو کبھی ایک ادیب، کبھی ایک شاعر تو کبھی ایک مزاح نگار اور کبھی ایک مترجم۔ لیکن ان تمام شخصیتوں میں جو چیز قدرِ مشترک ہے وہ ہے اندرونِ ذات کا کرب، جو باہر نکل آنے کے لیے ہمیشہ بے تاب اور بے چین رہتا ہے۔ جب بھی کبھی اسے اظہار کا وسیلہ ملتا ہے تو وہ خود کو اہلِ ذوق و اہلِ دل کے آگے بالکل بے نقاب و بے حجاب کر دیتا ہے۔ لیکن اس بے نقابی و بے حجابی کی کیفیت میں بھی ایک پردہ داری رہتی ہے جو ان

کی شخصیت کو تہذیب و شائستگی اور وقار و احترام عطا کرتی ہے۔ آپ کی نظموں اور غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ ''عکس خیال'' (معہ انگریزی ترجمہ) میرے اس خیال کی تائید و توثیق کے لیے کافی ہے۔

یوں تو اس کے تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں آزاد نظمیں، دوسرے میں غزلیں اور تیسرے میں پابند نظمیں ہیں۔ لیکن اگر آپ ایک حساس دل اور بیدار ذہن کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں تو اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچیں گے کہ یہ تینوں ابواب اندرونِ ذات کے کرب کے اظہار اور تہذیبی و سماجی کشمکش پر مرثیہ خوانی سے عبارت ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو شائد غلط نہیں ہوگا کہ آخری دونوں ابواب پہلے باب کے تکملہ ہیں۔ اور اگر بہ زبان شاعری وضاحت کی جائے تو پہلے باب کی پہلی نظم مصرعہ اولیٰ ہے تو آخری نظم مصرعہ ثانی۔ درمیان کی جتنی بھی نظمیں ہیں وہ الگ الگ شعری وجود ہیں جو اپنے آپ میں مکمل اور بھرپور ہیں۔

زندگی ایک ایسی ٹھوس، اٹل مگر فانی حقیقت ہے کہ وہ ہر ذی روح کو کچھ بھی کرنے کا بس ایک ہی موقع دیتی ہے۔ یہ آپ کے شعور و آگہی کے اوپر ہے کہ آپ اس موقع کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب نے اس حقیقت کو شعری اشاروں اور کنایوں میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ عمر کے کسی نہ کسی پڑاؤ پر اس بنیادی حقیقت کا ادراک ہر کس و ناکس کو ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو آپ کس انداز میں لیتے اور ان لمحات کو کس انداز میں جیتے ہیں۔ نظم ''اکیلی کتاب'' دراصل زندگی کی حقیقتوں کے اظہار کے پیرایے میں اندرونِ ذات کا کرب لوگوں سے شیئر کرتی ہے۔ شاعر اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر نظر ڈالتا ہے تو یہ خواہش کروٹ لینے لگتی ہے کہ ''کاش ایسا پھر ہوتا'' لیکن ایسا دوبارہ نہیں ہوتا اور زندگی کسی کو دوسرا موقع نہیں دیتی۔ اس کے باوجود جناب رضوان اللہ صاحب تنہائی میں پرانی یادیں کریدتے ہیں اور جب پلکیں نمناک ہو جاتی ہیں تو نیند کے پیچھے بھاگنے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن ایسے میں نیندان سے بھی برق رفتاری سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور اپنی آغوش وا کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اذیت و کرب کی زیادتی دیکھ کر وہ بھی روٹھ جاتی ہے اور ایک نئے غم والم کے سمندر میں غوطے لگانے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

نظم ''پت جھڑ'' بھی اندرونی کرب کا مرثیہ ہے۔ اس مختصر سی نظم میں زندگی کی مسرتوں اور شادمانیوں، خوش کامیوں اور خوش خرامیوں کو حسرتوں، مایوسیوں، ناکامیوں و نامرادیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا شاعر کی مجبوری ہے اور اس مجبوری نے دل کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

اس پیڑ پر پھل پھول تھے
بچوں کے پتھر آتے تھے
پھولوں کی جیسے پھلجھڑی
کیا سایہ تھا دیوار تھا
کتنے تھکے ہارے ہوئے
مہجور و محزوں کتنے ہی
دم لے کے بڑھتے تھے یہیں

لیکن جب گلستانِ حیات میں خزاں کا دور دورہ ہوا تو سب کچھ ختم ہو گیا:

بچے نہیں بوڑھے نہیں
نوخیزیاں کترا گئیں
راہی تھکے ہارے نہیں
گویا نشان رہ نہیں
بس کچھ دنوں کی بات ہے

یہ ''بس کچھ دنوں کی بات ہے'' حسرتوں کا ایک ایسا بحرِ متلاطم ہے جو شاعر کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور اس بحر متلاطم سے کسی کو مفر نہیں۔ اور اس نظم کا آخری مصرعہ تو ایسا ہے کہ اس سے بڑی کوئی صداقت نہیں، کوئی سچائی نہیں۔ لیکن اس مصرعہ آخر کو اس کے پہلے مصرعہ کے ساتھ پڑھیں تو ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ''بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر آئیں گے تیشے لیے۔'' گلشنِ حیات کا وہ درخت جو شجر سایہ دار تھا جب خزاں کا شکار ہو گیا اور سایہ و ثمر کی امیدیں ختم ہو گئیں تو اس کا مصرف صرف یہی ہے کہ اسے قطع و برید کے انجام سے ہمکنار کر دیا جائے۔ زندگی تو یہی ہے کہ جب اس کا کوئی مصرف نہیں رہ جاتا تو پھر اس کی بقا کا کیا جواز۔ تیشے ہوں یا پھاوڑے، کام دونوں کا ایک ہی ہے۔

کرب و اذیت اور حزن و ملال کا کوئی کنارہ نہیں، کوئی ساحل نہیں۔ ''جراحتوں کی سوغات'' ہو یا ''پرانے درد کا بیدار ہو جانا'' سب ایک ہی کیفیت کے الگ الگ مظہر ہیں۔ جراحتوں کی سوغات کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اور پرانے دردوں کا کوئی گاہک نہیں ہوتا۔ ان سوغاتوں کو خود ہی اپنا پشتارہ بنانا پڑتا ہے اور درد کی گٹھری کو اپنے ہی دوش پر ڈھونا پڑتا ہے۔ ایسے میں درد کی لذتوں کو دوام حاصل ہو جاتا ہے اور ان لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا فن اگر آتا ہے تو ''راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا'' کا مزا آجاتا ہے۔

ایک نظم ہے ''آہنگ نشاط''۔ جب کوئی خوشگوار حادثہ گزرے ہوئے رنگین لمحوں کو بیدار کر دیتا ہے یا پرانی پرلطف یادوں کے چراغ روشن کر دیتا ہے تب کہیں جا کر ایسی نظم تخلیق ہوتی ہے۔ اس نظم میں جو کیفیتِ مسلسل ہے وہ بہت سے سوالات کے در وا کرتی ہے اور آخر میں اس نتیجے پر جا کر ختم ہو جاتی ہے کہ یہ وہ سوال ہیں، جن کے جواب کسی کے پاس نہیں۔ اب نہ تو شراروں میں کوئی حرارت ہے اور نہ ہی نگار خانوں میں کوئی حسین پیکر:

صبا کی گل پر لطیف دستک
پھوار شبنم کی پنکھڑیوں پر

سکوں فروشی خرامِ خوش کی
کہ خوابِ تازہ کی دیدِ پیہم
کہ سعی پُر کیف و وجد آگیں
کہ دست گلگوں کی دل پہ دستک
یہ کیا ہے پروردگار میرے
کسے شراروں کی جستجو ہے
کتابِ ہستی پلٹ رہا ہے
ورق ورق کو الٹ رہا ہے

وہ جو کوئی بھی ہے یہ سب کیوں کر رہا ہے، کیا اس میں کوئی لذت کوشی ہے، کیا ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کیونکہ:

کتابِ ہستی کے باب سوئے
نگار خانوں کے خواب سوئے
جوانیوں کے عذاب سوئے
سوال جاگے جواب سوئے

یہ نظم دراصل کیف و سرمستی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے یا یوں کہیں کہ ان سرمستیوں کے پیرایے میں رنج و نشاط کی کشمکش کو واضح کرتے ہوئے قاری کو درد کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور سچ بات یہ ہے کہ یہ بھی درونِ ذات کے کرب کی ایک شکل ہے، ایک مظہر ہے۔

ایک نظم ہے ''تلاش''۔ اس میں شاعر نے قدروں کے زوال پر ماتم کیا ہے۔ آج ملک میں انسانی احترام کی ردا جس طرح چاک چاک ہوئی ہے اس نے ہر ذی شعور کو فکر مند

کر دیا ہے۔ آج اگر آپ آدمی کو تلاش کرنے نکلیں تو ناکامی ہاتھ لگے گی۔ انسانوں کے سمندر میں انسان تو ملیں گے، یہاں تک کہ فرشتے بھی ملیں گے لیکن وہ آدمی نہیں ملے گا جو ایک دوسرے آدمی کا ہمدرد بن جائے، اس کا شریکِ غم بن جائے۔ آدمی کہاں ملے گا؟ محفلوں میں، مجلسوں میں، معبدوں میں؟ نہیں کہیں نہیں۔ پھر...... مجھے آدمی کی تلاش ہے۔

ایسے آدمی کی جو آدمی ہو
ایسا آدمی جس میں آدمیت ہو
مجھے آدمی کی تلاش ہے
اور وہ تو میں ہی ہوں

اس آخری مصرعہ میں جو حیرانی ہے وہ ذات کی تلاش کی طرف ہمارے شعور کی لگام کو موڑ دیتی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے مشینوں کی حکومت کو روح کی موت قرار دیا تھا۔ نظم ''احوال'' بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے لیکن بہ اندازِ دگر۔ اس کے بین السطور میں یہی مفہوم پوشیدہ ہے کہ جب روح کو غلامی کی عادت پڑ جاتی ہے تو اقوام انقلابات سے ناآشنا ہو جاتی ہیں اور اجتماعیت کی جگہ انتشار کی شکار بن جاتی ہیں۔

آج کی دنیا جو خود کو ترقی یافتہ یا ترقی پذیر کہہ رہی ہے دراصل بے سمتی کا شکار ہے۔ لوگ ہوا کے دوش پر سوار بس بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ جس کارواں میں شامل ہیں اس کی بھی کوئی سمت نہیں، اس کی کوئی دِشا نہیں۔ جب ایک حساس دل اس کیفیت کو محض دیکھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ''برسرِ راہ گزر'' جیسی نظمیں جنم لیتی ہیں۔

آج کی دنیا انٹرنیٹ کی دنیا ہے جو ہر شعبہ حیات میں مکمل طور پر ڈیجیٹلائز ہو جانا چاہتی ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں کہ اعداد کا یہ کھیل اسے تباہی و بربادی کے سمندر کی طرف لے جا رہا ہے اور ایک روز یہ اعداد اسے اس طرح فنا کر دیں گے کہ پھر وہ گنتی ہی بھول جائے

گی۔ ''نئے آدم کی تلاش'' اسی جانب اشارہ کرتی ہے:

آدمی آدم بنائے گا نیا، بالکل نیا
پھر اسی آدم کی تخلیقِ مکرر سلسلہ در سلسلہ
سارے سانچے توڑ دیں گے اس نئے پیکر کے بعد
ایک رنگت، اک قد و قامت، زبان و نسل ایک
گنتیاں ہوں گی، عدد ہوں گے، بجائے نسب و نام
بے خبر ماضی سے، مستقبل سے نا آگاہ سب
حال میں جیتے رہیں گے حال میں مر جائیں گے
آدمیت، دوستی، انصاف، امن و آشتی
یعنی فرسودہ لغات
علم، تعلیم و تلمذ ایک ساتھ
سب سے گہری کھائی میں تاریخ کی
دفن کر کے اس سے فرصت پائیں گے
پھر ستاروں کا جہاں ہوگا
وہیں اڑ جائیں گے

یہ نظم محض نظم نہیں، مستقبل کی تباہی و بربادی سے آگاہ کرنے والا جرسِ کارواں ہے، ناقوسِ وقت ہے۔ کاش یہ دنیا جو اعداد کے چکر میں پھنس گئی ہے اس کی ہولناکیوں سے آگاہ ہو پاتی۔

اب اس باب کی آخری نظم پر ایک نظر جس کا عنوان ہے ''کتاب کا آخری باب'' اور جسے میں نے غزل کا مصرعہ آخر قرار دیا ہے۔ پہلی نظم نے جس کا عنوان تھا ''اکیلی کتاب'' جس کرب و اذیت اور رنج و محن کا ابتدائیہ پیش کیا تھا، اس آخری نظم نے اس کا اختتامیہ لکھ دیا

ہے۔المیہ یہ ہے کہ کتابِ زندگی کو دوبارہ لکھا نہیں جا سکتا اور مقامِ افسوس یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ سب محو ہوگیا ہے، بے عکس ہوگیا ہے، بے چہرہ ہوگیا ہے۔ سارے مناظر دھندلا گئے ہیں، سارے صفحات سپاٹ نظر آرہے ہیں، الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا ہے اور قلم ترجمانی دل سے تائب ہوگیا ہے۔کتاب کے قاری ایک ایک کر کے منظر سے غائب ہو گئے ہیں اور مزید تحریر کے لیے کچھ بچا نہیں ہے۔واقعی کتاب کا آخری باب لکھنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے،اس کا اندازہ ایک خاص مرحلے ہی میں جا کر ہوتا ہے۔

میں نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ جناب رضوان اللہ صاحب نے ذات کے کرب کو اپنے مخصوص پیرایہ بیان میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے اور عکس خیال کی تخلیقات، احساسات و جذبات کے اظہار کا ایک کامیاب ذریعہ بن گئی ہیں۔اس کی غزلیں بھی اسی پیرایے میں ہیں اور پابند نظمیں بھی۔مثال کے طور پر:

حال ہمارا کیا پوچھو ہو آگ دبی اکساؤ ہو
شعلے کب کے راکھ ہوئے اب خاک انھیں لہکاؤ ہو
کیسی کوئی چاہت واہت بہکی بہکی باتیں ہیں
اپنی اپنی راہ لگو کیا سنکے کو سنکاؤ ہو

ازل سے سنی اجاڑ بستی میں کوئی مہماں ہوا نہیں ہے
کوئی بھی نغمہ سرا نہیں ہے کہیں بھی رنگ حنا نہیں ہے

آنکھوں میں جو منظر ہے وہ منظر نہیں ملتا
کیا وقت پڑا ہے کہ مرا گھر نہیں ملتا

یہ آخری مصرعہ دراصل موجودہ ہنگامہ آرائیوں میں انسانیت کے گم ہو جانے کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔

خالی آنکھوں میں خواب دیکھتے ہیں
تشنہ لب ہیں سراب دیکھتے ہیں
جو لکھے تھے کتاب ہستی میں
دھندھلے دھندھلے سے باب دیکھتے ہیں

اسی طرح اس مجموعہ کی پابند نظمیں بھی درد کے سمندر میں غوطہ زن کر دیتی ہیں۔ ''عکس خیال''، محض عکس خیال نہیں بلکہ برہنہ سچائیوں کی تمثال ہے اور جناب رضوان اللہ صاحب کی مملکتِ فکر و سخن کا ایک گوہر آب دار ہے۔ اس پر ان کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

sanjumdelhi@gmail.com

◈◈◈

مصنف کا اپنا ترجمہ

ف.س.اعجاز، کلکتہ

رضوان اللہ صاحب کہنہ مشق صحافی ہیں۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے کلکتہ ان کا مستقر تھا۔ رٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنے علمی شوق کے تنوع اور وسعت کی خبر اس طرح دی کہ وفور کے ساتھ اپنی شاعری نظموں اور غزلوں کی شکل میں مختلف رسائل اور پھر مجموعوں کے روپ میں شائع کروائی۔ کلکتہ سے وابستہ اپنی صحافتی زندگی کی یادوں پر مشتمل ایک وقیع کتاب بھی شائع کی۔

کلکتہ سے متعلق مقامی شعرا نے وقتاً فوقتاً نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جن میں سید حرمت الاکرام مرحوم کا نام ان کی طویل نظم ''کلکتہ ایک رباب'' کی وجہ سے معروف ہوا۔ حال میں رضوا اللہ صاحب کی بھی کلکتہ سے متعلق چند نظمیں نظر سے گزریں۔ ان نظموں میں ''کلکتہ کو سلام''، ''درگا پوجا'' کے علاوہ کلکتہ میں کہی گئی ''تقسیم اور اس کے بعد'' عنوان کی نظم بھی قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو کلکتہ کے تمدن سے وابستہ رضوان اللہ صاحب کا شعور انھیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ نہیں ہونے دیتا۔ ان کی ایک سے زائد فنی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی

مترجم کے حیثیت کا۔ یہ گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی ہے۔

اچھی کوششیں فن کے پارکھ کو خود متوجہ کر لیتی ہیں۔ اپنی اردو شاعری کے لسانی متبادل کے طور پر رضوان اللہ صاحب نے انگریزی متن ملاحظہ کے لیے روانہ کیا ہے۔ ترجمہ کے فن پر عجلت میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ لفظی متبادل کامیابی سے برتنے کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے، بعض لوگوں کی رائے میں ٹیگور نے اپنی ہی کئی بنگالی نظموں کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا اس سے بہتر ترجمہ دیگر مترجمین نے پیش کیا۔ جب تک رضوان اللہ صاحب کی شاعری کا کسی اور کا ترجمہ سامنے نہیں آتا، ان کے اپنے ترجمے کو خوش آمدید کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ یہ مصنف کا اپنا ترجمہ ہے۔ اس نے اپنی آزادی سے کیا ہے۔

◈◈◈

عکسِ خیال

My Reflections

شاعر	:	رضوان اللہ
صفحات	:	184
قیمت	:	200/-
اشاعت	:	2013
مبصر	:	وصیل خاں

شاعری کو اگر الہامی درجہ پر فائز کیا جاتا ہے تو میری دانست میں وہ سو فیصد درست تصور ہے کیونکہ شعر گوئی ایسا فن ہے جسے ہم صرف اور صرف خدائی عطیہ کہہ سکتے ہیں، اس کا تعلق محض علم سے ہی نہیں بلکہ بصیرت سے بھی ہوتا ہے۔ بصیرت و ذہانت، فکر و تدبر وہبی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی یہ نعمت خاص اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دنیا کے کسی خطے سے حاصل کرلیں اور زورِ علم پر اشعار ترتیب بھی دے لیں لیکن تخلیق میں وہ وفور و تلاطم اور تخئیل کی سربلندی کہاں سے

لاسکیں گے جو اصلاً آپ کے دامن میں موجود ہی نہیں ہے۔اس کے برعکس ایک معمولی پڑھا لکھا انسان اپنی وہبی ذہانت و فطانت کے ذریعےفن پارہ پیش کرنے میں پوری طرح اپنی قوت وقدرت کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔

''عکس خیال'' کے مصنف رضوان اللہ صاحب ہیں جنھیں قدرت نے وہبی اور کسبی دونوں ہی علوم سے نواز رکھا ہے۔علمی سطح کے اعتبار سے انتہائی زرخیز علاقہ اعظم گڑھ سے ان کا تعلق ہے جس کے لیے اقبال سہیل نے کبھی کہا تھا ''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے''۔کلکتہ میں ایک طویل مدت تک صحافت سے منسلک رہنے کے بعد وہ دہلی میں امریکن سینٹر سے وابستہ ہوگئے اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ان کی شعری تخلیق 'عکس خیال' بالاستیعاب دیکھی اور بار بار دیکھی، ہر مرتبہ معانی وتصورات کا نیا نیا زاویہ ابھر کر سامنے آیا۔اشعار میں اتنی تہہ داریاں، اتنی جہتیں ہیں اور زبان وبیان کے اتنے دریچے وا ہوتے ہیں کہ زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور زاویوں کے ساتھ انتہائی واضح انداز میں جلوہ فگن ہوجاتی ہے۔ان کا وصف یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو بے خبری سے شعور وآگہی کی راہ دکھاتے ہیں کیوں کہ اچھی شاعری میں بے خبری کا کوئی گزر نہیں۔ان کے اشعار جذبات کو برانگیختہ کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ قاری کو اپنے گردوپیش کی وہ جھلک بھی دکھاتے جاتے ہیں جن میں الفت ومحبت، شقاوت ودرندگی، ایثار وقربانی، درد وغم، وفا شعاری اور کمینگی وعیاری کی واضح ترین صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ایسے دور میں جب پورا معاشرہ فتنوں سے بھرا ہوا ہو حقائق کو پوری وضاحت اور صاف گوئی سے بیان کردینا ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔زندگی کے تمام داخلی وبیرونی تجربات پر عمیق نظری کے ساتھ ان کی نگاہیں سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر بھی بڑے ماہرانہ انداز میں پڑتی ہیں اور جب وہ انہیں انسانیت کے سانچے میں ڈھال کر شعری پیکر میں تبدیل کرتے ہیں تو پھر یہی طرزِ بیان انہیں انفرادیت کے افق پر روشن کردیتا ہے۔انگریزی اور اردو کے ساتھ فارسی پر بھی ان کی گرفت بہت مستحکم

ہے جس کا مشاہدہ کتاب میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

رضوان اللہ نے اپنی نظموں اور غزلوں کا خود انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے ایک صفحہ پر اردو اور فارسی کلام اور سامنے کے صفحے پر انگریزی ترجمے دیے گئے ہیں۔ ترجمے کیسے ہیں اس تعلق سے ہم اپنی رائے نہ پیش کرتے ہوئے اردو کے مشہور و معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے پیش کیے دیتے ہیں ''اردو کا کلام سادہ مگر اچھا ہے لیکن انگریزی ترجمہ عام طور پر شاندار ہے۔ میں نے حال میں جو ترجمے دیکھے ہیں ان سے کہیں زیادہ بہترین۔'' ف س اعجاز کا یہ تجزیاتی تاثر بھی کتنا درست ہے: ''رضوان اللہ صاحب کا شعور انہیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ نہیں ہونے دیتا۔ ان کی ایک سے زائد فنی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی مترجم کی حیثیت کا۔ گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی۔'' کتاب نظم و غزل دو حصوں پر مشتمل ہے اور دونوں صنفوں میں قوتِ اظہار نہایت مستحکم و توانا ہے۔ کتاب سے کچھ اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں امید ہے کہ آپ ضرور پسند کریں گے:

نئے اصحاب فیل ان کے شکاری
ابابیلوں کی شاید پھر ہے باری

حال ہمارا کیا پوچھو ہو آگ دبی اکساؤ ہو
شعلے کب کے راکھ ہوئے اب خاک انہیں لہکاؤ ہو

تیری انا پئے خروش میری انا گلیم پوش
فکر تری گریز پا سرتا قدم ہوں گوش و ہوش

بھولی بسری باتیں چھوڑو عہد گریزاں لائے کون
ہم بھی قاتل تم بھی قاتل اس پر اب پچھتائے کون

سحر دمید بیا بام و درکشادہ کنیم
بیا کہ قصۂ فصل بہار تازہ کنیم

اک پتنگے کو بھی مقام فنا
گرمیٔ عشق ہی سے ملتا ہے

(اردو بک ریویو، جنوری، فروری، مارچ 2014)

◈◈◈

مکتوبات

ڈاکٹر ایم شافع قدوائی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی

۲۲؍نومبر ۲۰۰۶ء

محترم رضوان اللہ صاحب   سلام مسنون!

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کا گرانقدر علمی تحفہ ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے تہِ دل سے ممنون ہوں۔ آپ کی تحریروں سے نہ صرف خوب واقف ہوں بلکہ آپ کے مضامین سے بھی برابر استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ آپ کی کتاب مسودہ کی شکل میں پہلے نظر سے گزر چکی تھی۔ آپ نے بڑی معروضیت اور علمی وقار کے ساتھ مشرقی ہندوستان علی الخصوص کلکتہ کی اردو صحافت کے خدو خال واضح کیے ہیں۔ معاصر اخبارات کے حسن و قبح اور ان کی ادارتی پالیسی کا بے لاگ جائزہ لیا جس پر جذباتیت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ آپ کی تصنیف کا امتیازی وصف ہے۔ اس نوع کی کتابیں اردو میں شاذ ہی ہیں۔

اردو صحافت کی مبسوط تاریخ اب تک سپرد قلم نہیں کی جا سکی ہے۔ امداد صابری کی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخ اردو صحافت تحقیق کے بنیادی اصولوں سے عدمِ واقفیت اور تاریخ کو اپنی ذاتی پسند، ناپسند کے حوالے سے بیان کرنے اور پھر اسنادی شہادتوں سے مکمل اغماض سے عبارت ہے۔ آپ نے کلکتہ کے معاصر اردو روزناموں کے گہرے تجزیاتی مطالعے سے اس خلا کو پر کرنے کی لائق تحسین کوشش کی ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر آپ کی محنت شاقہ کی داد نہ دی جائے۔ آپ نے 'آزاد ہند'، 'عصرِ جدید' اور 'اخبارِ مشرق' سے متعلق اپنے Anecdotes کو بڑے دلچسپ اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے، جو زبان پر آپ کی مکمل دسترس پر دال ہے۔ کتاب کا عنوان ہر چند کہ شمس الرحمان فاروقی صاحب کا تجویز کردہ ہے، آپ کے بقول ''کچھ عجیب سا'' ہے۔ مجھے یہ ٹائٹل خاصا Pretentious لگا گو کہ آپ کی تحریر پر Self-Exaltation کے سائے لرزاں نہیں ہیں۔

کتاب کی دوسری جلد میں نے یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری مولانا آزاد لائبریری کو دے دی ہے، تاکہ اساتذہ اور طلبا اس سے استفادہ کر سکیں۔

باقی حالات بدستور ہیں۔ یاد آوری کے لیے ایک بار پھر شکریہ

بخدمت　　فقط

جناب رضوان اللہ صاحب　　نیاز مند

D-178, Abul Fazl Enclave　　**شافع قدوائی**

New Delhi - 110025

◈◈◈

علقمہ شبلی
کولکاتا - ۷۰۰۰۱۶
۳۰/اکتوبر ۲۰۰۶ء

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

برادرِ مکرم رضوان اللہ صاحب! ماہ صیام اور عید سعید مبارک

آپ کی دونوں کتابیں مل گئی تھیں۔ فون پر اطلاع بھی دے دی تھی۔ ''اوراقِ مصور'' میں کلکتہ کے مختلف روپ طرح طرح سے جلوہ دکھاتے ہیں اور اس شہر کو زندگیِ نو عطا کرتے ہیں۔

''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' آپ کی اہم تصنیف ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا۔ کتاب جب تک ختم نہیں ہوئی ہاتھ سے نہیں چھوٹی اور جب ختم ہوگئی تو ہل من مزید وردِ زبان رہا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ یہ کتاب، جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے، کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ بھی ہے اور آپ کی خودنوشت بھی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک آپ کا تعلق یہاں کی اردو صحافت سے براہِ راست رہا اور ایک سرگرم صحافی کی طرح آپ اس کے نشیب و فراز کے چشم دید گواہ رہے اور اسی لیے اس کی تفصیلات میں حقیقت کی جھلکیاں بھی ہیں، دلچسپی کے عناصر بھی اور عبرت کے واقعات بھی۔

اردو صحافت میں مالک و ملازم کی آپسی کشاکش کے حوالے سے جو واقعات آپ نے بیان کیے ہیں، وہ تلخ اور عبرت ناک حقیقت ہیں۔ انتظامیہ کی تنگ دلی، صحافیوں کے استحصال اور ابتر معاشی حالت کے باوجود ہم پیشہ صحافیوں کے متعلق آپ کا وثوق سے یہ کہنا کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی'' بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

کلکتے کی اردو صحافت کی اس سرگزشت میں ملکی سیاست خاص طور سے مسلم

سیاست کے تعلق سے آپ کے خیالات متوازن اور فکر انگیز ہیں۔ ان سے اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن معروضیت کی داد نہ دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ مسلم اداروں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مسلم درس گاہوں پر آپ کی طائرانہ رائے زنی بھی آپ کی مثبت سوچ کی غماز ہے۔ اس میں کلکتہ کے بیشتر صحافیوں کا ذکر ہے جن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو ریگ زارِ وقت میں گم ہوگئے ہیں اور جن کی یاد آپ نے تازہ کردی ہے۔ ادریس الحق، بسنت کمار چٹرجی، حامد محمود نیازی، سید محمد مصطفیٰ صابری اور اسرائیل احمد وغیرہ کچھ ایسے ہی صحافی ہیں۔

اردو روزناموں کے درمیان صحافتی چشمکوں اور ذاتی رقابتوں پر بھی آپ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ 'عصرِ جدید'، 'روزانہ ہند' اور 'آزاد ہند' کے فکاہیہ کالم قلم کی جولانیوں اور زبان کی بے لگامیوں کے خاموش گواہ ہیں۔ قارئین کو ان کا انتظار رہتا تھا اور یہ کالم دلچسپی سے پڑھ جاتے تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ صحت مند صحافت اس سے متاثر ہوئی۔

کلکتے کے ذکر نے صرف غالبؔ ہی کے سینے میں تیر نہیں مارا تھا بلکہ جو بھی یہاں آیا وہ اس تیر نم کش کی خلش محسوس کیے بغیر نہ رہا۔ آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کلکتے سے مراجعت کے بعد آپ نے دہلی میں ایک نیا کیریئر شروع کیا جہاں نسبتاً تنخواہ بھی معقول تھی اور دوسری رعایتیں بھی حاصل تھیں اس کے باوجود ''کلکتے سے جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ ناقابلِ شکست تھا۔'' کلکتہ طرح طرح سے آپ کے دامن تھامے رہا اور اس کی جلوہ گری کبھی ''اوراقِ مصور'' کی صورت میں اور کبھی ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کے ذریعہ ہوتی رہی۔

زبان و بیان پر جو آپ کو قدرت ہے، اس کی جھلکیاں کتاب میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ یقیناً کتاب اس قابل ہے کہ اس کی پذیرائی کی جائے۔ اگر آپ اس طرف توجہ نہ کرتے تو خود پر ظلم کرتے یا نہ کرتے، ہم قارئین پر ضرور ظلم ہوتا اور اردو صحافت کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہ جاتے۔ اس سے فرضِ کفایہ کی ادائیگی تو ہو ہی گئی ساتھ ہی ساتھ

بعد میں آنے والے اس چراغ سے چراغ روشن کرتے رہیں گے اور آپ کی ہدایات پر عمل کر کے اس راہ دشوار کو بہ آسانی طے کریں گے۔ آخر میں آپ ہی کا شعر ذرا ترمیم کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

تمام عمر نشستید و شب سحر کردید
کہ سنگ ریزہ ہارا رشکِ صد گہر کردید

اب میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ معالجین کی ہدایت ہے کہ زیادہ نقل وحرکت نہ ہو اور دماغی و ذہنی کاموں میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے۔ اس لیے گھر میں مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے، دعائے خیر فرمائیے۔

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخر و عافیت ہوں۔ کبھی کبھی یاد کر لیا کیجیے۔

بندۂ خلوص
علقمہ شبلی

◈◈◈

حصہ دوم

قومی آواز

نام کتاب : قومی آواز : جدید اردو صحافت کا معمار
مصنف : سہیل انجم
اشاعت : ۲۰۲۲ء

حال ہی میں ایک روز سہیل انجم صاحب آئے اور ایک خوشگوار اور روح افزا تحفہ عنایت کیا۔ اس کے ساتھ ہی یادوں کے محافظ خانے کے دریچے کھلنے لگے اور ہر طرف مسکراتے ہوئے مانوس چہرے دعوتِ نظارہ دینے لگے۔ میری عمیق تنہائی میں اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ ان چہروں کا شمار کہاں سے شروع کروں، کیوں نہ اس کا آغاز سہیل انجم ہی سے کروں، ان کے علاوہ فرحت احساس، عبدالحئی، منصور آغا کے بارے میں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ جولانیِ حیات کا ثبوت دے رہے ہیں۔ عشرت علی صدیقی، موہن چراغ، نیاز اعظمی (بمبئی)، سید محمد رافع اور شاہین محسن (پٹنہ) کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم بڑے لائق و فائق، بیحد خوش مزاج اور خوشگفتار، صحافی اور دوست تھے۔ نیاز اعظمی (بمبئی) کلکتہ میں میرے ساتھ عصرِ جدید میں کام کر چکے تھے، میں انھیں عزیز بھائی کی طرح سمجھتا تھا۔ وہ انقلاب

میں نیوز ریڈر ہوگئے تھے میں جب بمبئی جاتا تو ایک دن ان کے ساتھ گزارتا اور ایک دن ایک اور اتنے ہی عزیز محمود ایوبی کے ساتھ جو اردو بلٹز کے اسٹنٹ ایڈیٹر تھے، وہ بھی میرے ساتھ کلکتہ میں عصر جدید میں کام کر چکے تھے۔ سید محمد رافع بھی کلکتہ میں میرے ساتھ عصر جدید میں کام کر چکے تھے۔

اور کس کس کا ذکر کروں 'قومی آواز' لکھنؤ میں بڑے لائق صحافی عثمانی غنی، حسن واصف عثمانی جو بلا پائپ کے نہیں نظر آئے، اختر یونس قدوائی جو شیروانی کے بغیر نہیں دیکھے گئے، لیکن ان کی شیروانی بند اور بٹن کی قید سے بالکل آزاد ہوا کرتی۔ افسوس کہ اتنے لائق صحافیوں کو صدیقی صاحب کی انانیت کے سائے میں سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ غالباً ۱۹۷۸ء میں قومی آواز لکھنؤ کے دفتر میں صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس تعارفی ملاقات میں ہی ان کی مزاجی کیفیت کا کچھ اندازہ مجھے ہوگیا تھا۔ اس کی تصدیق زیرِ نظر تصنیف میں شامل قیصر تمکین کے ایک جملے سے ہوتی ہے ''عشرت صاحب کا خیال تھا کہ دنیا کی تخلیق ہندوستان کو مرکز کائنات بنانے کے لیے ہوئی تھی اور اس مرکز کائنات کا مرکز قومی آواز تھا، جس کے مرکز وہ خود تھے۔''

صدیقی صاحب کے متعلق مجھے ایک اور تجربہ ہوا جس کی تصدیق قیصر تمکین کے مضمون میں اس عبارت سے ہوتی ہے: ''عشرت صاحب اپنی اس کٹر اصول پرستی کی بنا پر تا حال کسی غیر ملکی دورے (مثلاً کلچرل وفود یا صحافتی کانفرنس وغیرہ قسم کی چیز) سے مستفید نہیں ہو سکے ہیں۔'' ایک واقعہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اخبار نویسوں کا ایک گروپ جس میں کئی مختلف زبانوں کے صحافی شامل تھے ایک مہینے کے دورے پر امریکہ جانے والا تھا۔ اس میں شمولیت کے لیے اردو صحافی کے طور پر میں نے موہن چراغی کا نام تجویز کیا جو کافی ردو قدح کے بعد منظور ہوگیا۔ اس وقت موہن چراغی سرینگر میں ہیرالڈ گروپ کے نامہ نگار تھے لیکن میں انھیں صدیقی صاحب کے جانشین کی نظر سے دیکھتا تھا، جو کہ درست ثابت ہوا۔ صدیقی

صاحب میری اس حرکت پر بہت چراغ پا ہوئے اور لکھنؤ سے ٹیلی فون پر تلخ کلامی کی۔ دہلی سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے کے بعد صدیقی صاحب ایک روز میرے دفتر میں امریکن سینٹر آئے۔ غالباً میرے کمرے میں آنے کے بعد انھیں یقین ہوگیا ہوگا کہ میں حکومت امریکہ کا واقعی ملازم تھا کوئی ایجنٹ نہیں تھا۔

اردو اخباروں کے مسلمان مالکوں کے متعلق میرے تجربات بہت تلخ ہیں۔ اس کی تائید بھی قیصر تمکین کی اس عبارت سے ہوجاتی ہے: ''حیات اللہ صاحب کی شخصیت کی تمام خوبیوں کے باوجود ان کا ایک پہلو ایسا ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔ وہ صحافیوں کی اضافۂ تنخواہ یا بہتر شرائط ملازمت کی تحریک کو اسی طرح ملک وقوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے جیسے انگلستان کے ٹوری پارٹی کے سامراج پسند۔ اس سلسلے میں انتہائی شرمناک ان کی وہ شہادت تھی جو انھوں نے پریس کمیشن کے اجرت بورڈ کے سامنے دی اور کہا کہ اردو صحافیوں کے لیے دس روپیہ ماہوار تنخواہ ضرورت سے زیادہ کافی ہے۔'' (یہ زمانہ ۱۹۵۸ء کا تھا)

قومی آواز کی اشاعتیں

آزادی سے قبل لکھنؤ میں قومی آواز کی اشاعت کے آغاز اور آزادی کے بہت برسوں بعد چار دیگر شہروں سے قومی آواز کی اشاعت کے تذکرے سے پہلے دو خاص باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

اول یہ کہ ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کے تین اخبارات نیشنل ہیرالڈ (انگریزی) نوجیون (ہندی) اور قومی آواز (اردو) تھے اور ایسوسی ایٹیڈ جرنلس نہرو گھرانے کی ملکیت میں تھا۔ آزادی کے بعد تقریباً چالیس سال تک ملک پر بلاشرکتِ غیرے نہرو گھرانے کی حکمرانی تھی ایسے میں سارے سرکاری اور غیر سرکاری اشہارات وسیع پیمانے پر ان اخباروں کو دستیاب تھے اور اشتہارات ہی اخباری اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ۱۹۴۵ء میں جب قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی، اس زمانے

میں شمالی ہند میں اردو اخبارات کا مسلمان قاری بڑی حد تک مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر تھا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ الجمعیت اور چند دیگر اردو ہفت روزہ اخباروں کا عام مسلمان قاری پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ایسے میں کانگریس پارٹی کو ایک اردو ترجمان کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ قومی آواز کے لیے میدان خالی تھا اور ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کا بنیادی ڈھانچہ موجود تھا۔ ان حالات میں لکھنؤ میں قومی آواز کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں تنویر اور کانپور میں سیاست جدید کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر اردو اخبار نہیں تھا۔

مسلم قاری بھی بڑے ذہنی آزار اور تذبذب کا شکار تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات ایک کابوس کی طرح مسلم ذہن پر سوار تھے۔ جلد ہی ملک کی آزادی کے ساتھ ہی اس کے دولخت ہونے کا المیہ وقوع پذیر ہوا۔ اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مہاجرت کے عذاب سے دوچار ہوا، کچھ تو فسادات کی زد میں آکر مجبور ہوئے، دانشور طبقہ کو ایک نئی مملکت میں بڑے مواقع کی فراوانی کی کشش محسوس ہوئی۔ شمالی ہند میں بڑے مسلمان زمینداروں اور امراء کی بڑی تعداد تھی اسے کانگریس کی خاتمہ زمینداری کی اعلانیہ پالیسی نے حواس باختہ کردیا تھا اور بہت جلد ۱۹۴۹ء میں سب سے پہلے یوپی میں خاتمہ زمینداری کا قانون نافذ کردیا گیا۔ ان گنت خوشحال مسلمان راتوں رات مفلوک الحال اور بے یارومددگار ہوگئے۔ ایسے میں ایک مستحکم اور سیکڑوں سال میں تربیت پائی ہوئی تہذیب کے تاروبود بکھر گئے۔ جو نوحہ خواں بچ رہے جیسے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ، سربہ گریباں تھے۔ ان حالات میں قومی آواز اظہار کا ایک ذریعہ بنا۔

اردو اخباروں کا مسلمان قاری اس وقت سخت ذہنی، روحانی اور جسمانی آزار و عذاب سے گزر رہا تھا۔ ''نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن، نہ راہ باز گردیدن'' کی کیفیت سے دوچار تھا۔ قیادت منتشر اور منقسم ہوکر ناپید ہوچکی تھی۔ ان تاریک راہوں میں اس کو راستے

کون دکھائے۔ ایسے میں قومی آواز کا ظہور روشنی کی ایک مدھم سی لکیر ثابت ہوا۔ لیکن اس روشنی کو دہلی تک پھیلانا بھی وقت کی ضرورت بنتا گیا۔

بات دہلی ایڈیشن کی

چنانچہ ایک عرصہ دراز کے بعد سہی لیکن وہ چراغ بہرحال روشن ہوگیا۔ اس وقت دہلی سے کئی اردو اخبارات شائع ہو رہے تھے لیکن میری مراد ان اخباروں سے ہے جن کا مخاطب مسلم قاری تھا۔ الجمعیۃ تقریباً جمعیت علماء کا ترجمان ہوکر رہ گیا تھا۔ دعوت بھی کم وبیش جماعت اسلامی سے وابستگی کے بعد زیادہ دور تک نہیں جاتا تھا۔ بقیہ دو تین اخبارات جو تھے وہ غیر ضروری مبالغہ آرائی اور ایک خاص ذہنی فضا کی تسکین کا سامان فراہم کرکے سرکولیشن بڑھانے سے سروکار رکھتے تھے۔ کسی طرح کی رہنمائی کا تصور انھیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔

ایسے میں دیر سے سہی لیکن ایک معیاری اور متوازن صحافت کے طور پر 'قومی آواز' کا نمودار ہونا اردو قاری کے لیے یقیناً ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک بھرپور اخبار تھا اور کئی طرح کی خوش قسمتی کی ہما اس پر سایہ فگن تھی۔ ہیرالڈ ہاؤس میں انفراسٹرکچر یعنی بنیادی سہولتیں موجود تھیں۔ لکھنؤ کی طرح دہلی میں بڑے لائق و فائق صحافیوں کی خدمات حاصل تھیں۔ نہرو گھرانے کا اثر ہلکا ہوتا جارہا تھا تاہم بڑی حد تک قائم تھا۔ ایک بار میں نے موہن چراغی سے کہا کہ بڑے بڑے انگریزی اخباروں کو بھی اپنی پبلسٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی اس مقصد سے مہمیں بھی چلاتے ہیں لیکن اردو اخباروں نے کبھی اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد دہلی کے مختلف علاقوں میں ہمارے اوکھلا میں بھی قومی آواز کی ہورڈنگ جابجا نظر آئی۔

لیکن افسوس ''ایں شعلۂ مستعجل بود'' جس کے کئی اسباب ہوئے۔ دہلی میں ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، اسٹیٹسمین اور پیٹریاٹ جیسے انگریزی اخباروں کے مقابلے میں کھڑا ہونا نیشنل ہیرالڈ کے لیے ناممکن تھا۔ اسی طرح ہندوستان،

نو بھارت ٹائمز اور کئی دوسرے ہندی اخباروں کے مقابلے میں نوجیون کا ٹکنا محال تھا۔ اس کے برعکس قومی آواز اقتصادی طور پر مستحکم اور خود کفیل تھا لیکن افسوس کہ اس کی کمائی پر ان دونوں ہم عصروں کی پرورش ہوتی رہی اور قومی آواز کی نبض بالآخر ڈوب گئی۔

ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہوئی۔ پریس کمیشن کے اجرتی بورڈ نے پچھاوت کمیشن کی تجویز کے مطابق کاتبوں کو صحافی تسلیم کر لیا تھا، چنانچہ انھیں سب ایڈیٹروں کے مساوی درجہ اور تنخواہ کا مستحق قرار دیا تھا۔ اس وقت تک اردو اخباروں میں کمپیوٹر اور کمپوزنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا، مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت اردو اخباروں کی پرنٹنگ کا کون سا طریقہ رائج تھا لیکن بہرحال سست رفتار تھا اور قومی آواز جیسے اخبار کی بروقت کاپی تیار کرنے کے لیے کاتبوں کی ایک بڑی ٹیم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب اجرتی بورڈ کا فیصلہ کاتبوں کے حق میں آیا تو ان کو بقایا واجبات کے طور پر بھاری رقوم ادا کی گئیں غالباً اس وقت کاتبوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی۔ وہ تو مالا مال ہو گئے لیکن قومی آواز کا بھٹہ بیٹھ گیا۔ جیسے سونے کے انڈے روزانہ دینے والی مرغی کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس کو ذبح کر کے سارے سونے کے انڈے ایک ہی دن میں نکال لوں، افسوس صد افسوس!

پٹنہ ایڈیشن

قومی آواز کا پٹنہ ایڈیشن جب شروع ہوا اس وقت وہاں ساتھی، صدائے عام اور سنگم نکل رہے تھے جو کانگریسی اور غیر کانگریسی مختلف سیاسی نظریات کے حامل تھے اور اپنی جگہ پر ان کی حیثیت مستحکم تھی۔ لیکن ایسوسی ایٹیڈ جرنلس جیسے وسائل رکھنے والے کسی ادارے کے لیے پٹنہ جیسے شہر میں انفراسٹرکچر کھڑا کرنا مثلاً اخبار کے دفتر اور پریس وغیرہ کے لیے جگہ حاصل کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی اور وہاں اچھے تجربہ کار صحافی بھی موجود تھے جو کہ دس بارہ سال تک وہاں قومی آواز کی اشاعت جاری رہنے ہی سے ظاہر ہے لیکن غالباً دہلی ہی جیسے ناسازگار حالات نے وہاں بھی اس کا گلا گھونٹ دیا۔

بمبئی ایڈیشن

قومی آواز کا بمبئی ایڈیشن بہت کم عمر ثابت ہوا۔ اس کے اسباب شروع سے ہی نمایاں تھے۔ اس کو اپنے دفتر کے لیے اردو خواں آبادی کے قرب و جوار میں کہیں جگہ نہیں ملی چنانچہ اسٹاف کے لیے بہت دور آنا جانا مشکل تھا۔ آج جس طرح بڑی بڑی کمپنیاں اپنے اسٹاف کی آمد و رفت کے لیے کیب کی سہولت فراہم کرتی ہیں اس کا اس وقت چلن نہیں تھا، اخبار کی تقسیم کے معاملے میں ہاکروں کا بھی مسئلہ رہا ہوگا۔ مزید براں اس کو انقلاب اور اردو ٹائمز جیسے مقبول اخبارات سے مسابقت کا بھی سامنا رہا ہوگا۔ ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کا انتظامیہ ان مسائل میں سے کسی کا حل بھی نکالنے میں ناکام ہوگیا۔ چنانچہ اس نے یہ دکان بند کر کے ہاتھ جھاڑ لیے۔ اس سلسلہ میں خلیل زاہد کا تکلیف دہ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ بمبئی کے اچھے صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے، انھیں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں جگہ مل گئی تو وہ دہلی آ گئے لیکن اس کے بعد جلد ہی بمبئی سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے کی بات ہوئی تو انھوں نے نے لپک کر اس موقع کو پکڑا۔ شاید بمبئی کی کشش کو اس میں دخل رہا ہو۔ اخبار جلد ہی بند ہوگیا پھر خلیل زاہد کہاں گئے کیا ہوئے۔ میں بمبئی جاتا آتا رہا لیکن ان کا کوئی ذکر کبھی نہیں سنا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت بھی گئی۔ افسوس ہوا۔

سرینگر ایڈیشن

اس کو بالکل حادثہ ہی کہہ لیجیے کہ ۱۹۸۹ء کے اطراف میں جب سرینگر سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی تو وہی زمانہ تھا کشمیر میں اس پرتشدد تحریک کے آغاز کا جس کا سلسلہ رک رک کر آج تک جاری ہے۔ اس زمانے میں مسٹر جگموہن جموں و کشمیر کے گورنر تھے اور فاروق عبداللہ وزیر اعلیٰ تھے۔ یاد نہیں اس وقت ایسی کیا انتخابی بے ضابطگی ہوئی یا کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ ایک پرتشدد تحریک پھوٹ پڑی۔

کشمیر سے نہ معلوم کتنے اردو اخبارات نکل رہے تھے جن میں سرینگر ٹائمز اور

'آفتاب' مقبول اور نمایاں تھے۔ پنڈت وطن کا خدمت بھی نکل رہا تھا جو کانگریس کا ترجمان تو نہیں تھا لیکن کانگریس پارٹی کے نظریات پر اس کی سیاسی پالیسی مبنی تھی۔

موہن چراغی لکھتے ہیں کہ سرینگر سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے سے پہلے ہی سرینگر ٹائمز کے مالک اور ایڈیٹر صوفی غلام محمد نے اس کی پُر زور مخالفت شروع کر دی تھی۔ دراصل وہ قومی آواز کو اپنے اخبار کے لیے ایک بڑا چیلنج سمجھتے تھے۔ ان کا یہ اندیشہ درست بھی ثابت ہوا۔ موہن چراغی لکھتے ہیں کہ قومی آواز کی اشاعت پانچ سو سے شروع ہوئی اور بہت جلد دس ہزار تک پہنچ گئی جو یقیناً بہت بڑی بات تھی۔ ایسے میں وہ پُر تشدد تحریک جو تقریباً اسی اثناء میں شروع ہوئی تھی، قومی آواز کے مخالفوں کے لیے ایک سنہرہ موقع ثابت ہوئی اور عین ممکن ہے انھوں نے کچھ تخریب پسندوں کا رخ قومی آواز کی طرف موڑ دیا ہو، چنانچہ اخبار کے اندر اور باہر بغاوتیں شروع ہوگئیں اور قومی آواز کی آواز بند ہوگئی۔ اللہ اللہ خیر صلّٰی۔

قومی آواز اپنے ہر ایڈیشن میں ایک مکمل اور متوازن اخبار تھا۔ ہر طرح کے قاری کی پسند کا کچھ نہ کچھ مواد اس میں موجود ہوتا۔ وہ کانگریس کی پالیسیوں کا علمبردار تھا۔ کانگریس پارٹی کی پالیسیاں مسائل حاضرہ کے متعلق دوٹوک اور صاف ہوتی تھیں اس لیے قومی آواز کی کسی تحریر میں اس کا واضح طور پر اظہار آسان تھا۔ اگر کبھی توازن میں فرق آتا تو وہ ایڈیٹر صاحب کے اپنے طریقہ اظہار ہی کی وجہ سے۔ ایک بااصول صحافی میں اَنا کا عنصر ضرور ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس میں بوقت ضرور ''نا'' کہنے کی جسارت پیدا ہوتی ہے، لیکن ''انا'' اور ''انانیت'' کے درمیان ایک باریک ساخطِ فاصل ہے جسے تحریروں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عشرت علی صدیقی اور موہن چراغی کی تحریروں میں کبھی کبھی اس کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

قومی آواز دہلی کے ہفتہ وار ضمیمہ میں فرحت احساس اور ریگولر ایڈیشن کے کالموں میں موہن چراغی میرے مضامین کو جگہ دیتے رہے اس کے لیے میں ان دوستوں کا سپاس

گزار ہوں۔ سہیل انجم کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب عطا کر کے مجھے اس اظہارِ تشکر کا موقع دیا۔

یہ کتاب ابتداً تعارفی مضامین کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ تعارفی مضامین پروفیسر اختر الواسع، جلال الدین اسلم اور ڈاکٹر سہیل وحید کے ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے قومی آواز نئی دہلی میں اپنے رفقائے کار کا نام بہ نام تذکرہ کیا ہے۔ ان یادوں کے ذریعہ ناموں کو زندہ رکھنے کا ایک قابل تقلید عمدہ طریقہ ہے۔ اسی باب میں موہن چراغی اور اشہر ہاشمی کے مضامین ہیں۔

دوسرا باب قومی آواز کے لکھنؤ ایڈیشن سے متعلق ہے جس میں عشرت علی صدیقی، عابد سہیل، قیصر تمکین اور قطب اللہ کے مضامین شامل ہیں۔

تیسرا باب قومی آواز کے بمبئی، پٹنہ اور سرینگر ایڈیشنوں کے متعلق ہے اس میں سعید حمید، ریحان غنی، اور موہن چراغی کی تحریریں شامل ہیں۔

چوتھا باب قومی آواز کے چند اہم مدیر اور صحافیوں کے تذکروں پر مشتمل ہے، اس باب میں دس صحافیوں کے متعلق مختلف اصحابِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔

آخر میں پس نوشت کے زیرِ عنوان قومی آواز کی ویب سائٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے سہیل انجم سنڈے نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون ویکلی کے اجرا کی خبر دیتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ہفتہ وار قومی آواز کے اجراء کی بشارت کب سناتے ہیں، جس کی ادارت کے لیے دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور دیدہ ور صحافی سہیل انجم کی شخصیت موزوں ترین ہوگی۔ دراصل کانگریس کے سیاسی زوال اور کئی اردو روزناموں کی موجودگی کے باوجود کانگریس کو اردو قاری سے مخاطبت کے لیے ایک ترجمان کی ضرورت ہے۔

(رضوان اللہ)

◈◈◈

کتب صحافت کی باز دید

مانچسٹر میں ''دی امیگرنٹ'' کے زیرِ اہتمام حال ہی میں ایک علمی اور ادبی ورکشاپ منعقد ہوئی جس کی مختصر روداد ہفت روزہ ''عالمی سہارا' کے شمارہ مورخہ ۱۳رجون ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس ورکشاپ میں کتابوں کی تصنیف کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی۔ مصنف اور تخلیق کار کی اہمیت پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر سارے مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی حلقوں کی نمائندگی ہوئی۔ اور مشاہیر ادب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک خاص نکتے پر میری نظر جم گئی۔ اس کی عبارت یہ تھی ''کتاب دراصل خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ جس ماحول میں انسان بستا ہے اس میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کو اپنے اندر نقش کرنے کے بعد اسے کاغذ پر تحریر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی تخلیق اس کی کتاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔''

بس میں اسی جگہ ٹھہر گیا اور اپنی تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کے مشمولات کو اپنی فکر کی روشنی میں دیکھنے لگا پھر مذکورہ بالا بیان کی صداقت کی روشنی میں اس کو پرکھنے لگا۔ دراصل یہ سب کچھ میں اس کتاب میں لکھ چکا ہوں۔ وہ ایک سوزِ دروں کا اظہار و بیان ہے۔ پہلے کوئی ربع صدی تک ایک الاؤ میں تپتا رہا اور مضطرب رہا۔ اس کے بعد کوئی

ربع صدی تک ان بھیانک تجربات کو اپنے وجود میں سمو کر مختلف طریقوں سے اظہارِ مدعا کی مشق کرتا رہا تب کہیں جا کر کسی کتاب کی شکل میں اظہار کی قدرت و جسارت اور اس کی اشاعت کا حوصلہ پیدا ہوا۔

جب اس کام سے فارغ ہوا تو ہر طرف نظر دوڑانے لگا کہ اس لپٹ نے کسی اور صاحبِ دل حقیقت شناس اور حق گو کے دامن کو بھی شعلہ سامانی عطا کی ہے یا نہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے، صحافت کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی ہے لیکن اپنے فن سے عشق اور اعتماد و یقین آتش نمرود میں بھی جست لگانے پر مہمیز کرتے ہیں، چنانچہ میری تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' وجود میں آئی۔ جہاں تک اس تصنیف کے مقصد کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو صاحبِ نظر کو کتاب کھولتے ہی انتساب کی عبارت سے ہو جائے گا۔''ان گمنام صحافیوں کے نام جن کا خونِ جگر شاہ سرخیوں کے کام آیا۔'' اس سے پہلے اردو صحافت کے موضوعات پر کتابیں خوب خوب لکھی گئیں مثلاً مولانا امداد صابری کی ''اردو صحافت کی تاریخ''، لیکن ان تصنیفات سے ان روح فرسا حالات کا اندازہ نہیں ہوتا جن سے آزادیِ وطن کے بعد مظلوم و مقہور زبان اردو کی صحافت سے چمٹے ہوئے حرماں نصیب صحافی گزر رہے تھے۔ میری تصنیف کا مقصد انہی کی جانسپاریوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر اپنی صحافت کی تاریخ میں محفوظ کرنا تھا سو میں نے شاید اپنے حصے کا کام کر دیا۔ یہ نہ اردو صحافت کی گزشتہ تاریخ ہے نہ سارے ہندوستان کی کہانی۔ اس میں صرف کلکتہ کے ایک منظر پر فوکس کیا گیا ہے جسے پوری صورتِ حال کا اشاریہ کہا جا سکتا ہے۔ اس تصنیف کے آگے پیچھے، آس پاس، اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد تصنیفات ملک کے مختلف خطوں میں منظرِ عام پر آئی ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے اردو صحافت کے ہم کنار ہونے کے بعد اس میں جو ترقیاں ہوئیں اور اسرار و رموز کے جو انکشافات ہوئے ان پر نئی تصنیفات میں خوب خوب لکھا گیا ہے، امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اردو صحافت کا استغاثہ

بہرحال جب میں نے دائیں بائیں ہم سفروں پر نظر دوڑائی تو صرف ایک مردِ مجاہد آتش زیر پا نظر آیا، پروانہ رودولوی۔ جس تپش نے آزادی کے بعد اردو صحافت کی آزمائشوں اور اردو صحافیوں کی جانسپاریوں کا رزمیہ لکھنے پر مجبور کیا اور ایک تصنیف کی شکل میں میرا سوزِ دروں متشکل ہوا وہ پروانہ رودولوی کی تصنیف ''اردو صحافت کا استغاثہ'' میں شعلۂ جوالہ نظر آتا ہے۔ میں نے زبان و بیان کے استعمال میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن وہ بالکل شمشیرِ برہنہ نظر آتے ہیں۔ اردو صحافیوں کے ساتھ مالکوں خصوصاً مسلمان مالکوں کی بدسلوکی اور ساتھیوں کی منافقت کے درد کی وجہ سے میری سسکیاں ان کے یہاں چیخ کی طرح سنائی دیتی ہیں۔ مثالیں پیش کرنے میں میں نے قدرے احتیاط سے کام لیا ہے لیکن پروانہ صاحب نے ہر احتیاط کو طاق پر رکھ دیا ہے۔ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ کلکتہ میں اردو صحافت کا کینوس قدرے محدود تھا اور تنوعات بھی نہیں تھے لیکن پروانہ صاحب کے لیے دہلی کا کینوس بہت وسیع اور رنگا رنگ تھا۔

اردو ادب کے ٹھیکے داروں کی طرف سے صحافیوں کی کم وقعتی پر میرے یہاں حرفِ شکایت دبا دبا ہے لیکن پروانہ صاحب بجا طور پر بالکل چراغ پا ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''ہر دور میں اعلیٰ پایہ کے ادیب اخبارات سے وابستہ رہے ہیں ...... اردو صحافت نے اردو زبان کو فروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمت انجام دی ہے اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی بھی اردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اردو صحافت ہی کا ذکر کرے گا جس نے نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور اردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام تک پہنچا کر اس کو مقبول بنایا۔'' وہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تصنیف ''صحافت پاکستان اور ہند میں'' سے یہ اقتباس پیش کرتے ہیں: ''صحافت کا مقصد صرف یہ نہیں رہا کہ قارئین تک خبریں پہنچائے اور انھیں اس کے پس منظر سے آگاہ

کرے۔صحافت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی رہا ہے کہ وہ لوگوں میں علم کو فروغ دے۔‘‘

اردو صحافیوں کی اعلیٰ صلاحیتوں کی ستائش کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا ’’ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔‘‘ پروانہ رودولوی بھی ان کے بے حد مداح اور ان کی صلاحیتوں کے معترف ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کے مشورے دیتے ہیں اور انھیں اردو کا سچا محافظ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو صحافت سے چشم پوشی کرنا بڑی بددیانتی قرار پائے گی۔صحافت بغاوت کی زبان ہے۔ میرے خیال سے صحافت بغاوت کی زبان ہو یا نہ ہو لیکن تنقید اور احتجاج کی زبان ضرور ہے۔

کچھ اردو صحافت ہی پر منحصر نہیں دنیا بھر کی صحافتوں کا بڑی حد تک ترجمہ پر انحصار ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر دنیا بھر کی زبانوں کے درمیان لین دین ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اردو صحافت میں مترجموں کی ناقدری پر پروانہ صاحب بہت برہم ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ جب ظفیر الحسن صاحب اس فن کی اہمیت بیان کرتے ہیں تو اس سے انھیں اتفاق نہیں ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر فضل الحق نے ’’اردو ماس میڈیا‘‘ کے زیرِ عنوان جو کتاب مرتب کی وہ صحافت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مبسوط مضامین پر مشتمل ہے اس میں پہلا مضمون سید ظفیر الحسن کا ہے ’’ترجمہ-ایک فن‘‘۔اس مبسوط مضمون میں ظفیر صاحب نے فن ترجمہ کے مختلف پہلوؤں پر خوب خوب بحث کی ہے جس کا اندازہ اس مضمون کے ذیلی عنوانات سے کیا جاسکتا ہے۔’’زبانوں کا آپسی رشتہ، زبان: تاریخ اور تہذیب کی ترجمان‘‘، ترجمہ: معلومات کے ابلاغ و ترسیل کا اہم وسیلہ،اخباری اور کتابی زبان، بارے انگلش کا کچھ بیان ہو جائے، نثری اور منظوم ترجمہ‘‘۔ظفیر صاحب کی ساری نکتہ رسی کے باوجود پروانہ صاحب اخباری ترجمہ کے سحر میں ایسے مبتلا ہیں کہ اس سے باہر آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فضل الحق کی کتاب میں اس مضمون کا حوالہ تو دیا ہے لیکن ترجمہ کی پرخار وادی کے معترف نہیں ہیں، حالانکہ ظفیر صاحب نے ترجمہ کی

بعض مشکل رہگزاروں کا تذکرہ نہیں کیا ہے جیسے کہ عدالتی کارروائیوں کا ترجمہ، سفارت کاری میں، جو کہ اقوام کے باہمی تعلقات کا اہم ترین وسیلہ ہے، ترجمہ کی ناگزیریت اور ترجمہ اور ترجمانی کا فرق وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ کتاب میں پانچ اصحاب کے نو مضامین شامل ہیں۔ مناسب ہوتا کہ ان حضرات کا مختصر تعارف بھی کتاب میں شامل کر دیا جاتا۔

آزادی کے بعد اردو صحافت جن آزمائشوں سے گزری ان کا میں نے اپنی کتاب میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے ان پر پروانہ صاحب کی بھی نظر ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اردو کے صحافیوں کو آزادی سے قبل جن حوصلہ شکن، سخت اور اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑا آزادی کے بعد ان سے بھی برے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔'' اس پر مستزاد میں نے ایک بڑی نازک سی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل میں کلکتہ کے پس منظر میں گفتگو کر رہا تھا جہاں ٹریڈ یونین تحریک زیادہ فعال تھی لیکن وہیں ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہونے کی وجہ سے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی تنظیمیں بھی زیادہ فعال تھیں۔ ''گویا دونوں طرف کی تنظیمیں اپنے اپنے وابستگان کی رہنمائی کے لیے پوری طرح آمادہ اور سرگرم تھیں ایسے میں گنے چنے اردو روزناموں کے مالکان کے لیے یہ بات طبعی تھی کہ (پریس کمیشن کی رپورٹ کے بعد پیدا شدہ حالات و معاملات میں) وہ بڑے بڑے اخباری مالکان سے رجوع کرتے اور نئے حالات میں ان سے قانونی رہنمائی حاصل کرتے۔ گویا وہ صنعتی تقسیم اردو اخباروں میں بھی کارفرما ہوئی لیکن اردو صحافت اور دیگر صحافتوں کے درمیان ایک خاص فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ اردو صحافت میں مالک اور ملازم دونوں ہی مظلوم اور حالات کے جبر کا شکار تھے اور ایک کمزور طبقے کے افراد کے طور پر جو مار پڑی ان کو جھیلنے والے دونوں ہی تھے۔''

اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں

سید عاشور کاظمی کی تصنیف ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا

میں'' سے موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں برطانیہ، سوئیڈن، ناروے، جرمنی، کناڈا، ڈنمارک اور امریکہ سے شائع ہونے والے ۱۱۹ اخباروں کا ذکر ہے، ان میں سے بیشتر ماہنامے یا ہفتہ وار ہیں، روزنامے صرف تین لندن سے شائع ہونے والے جنگ، ملت اور اردو ٹائمز ہیں۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، برصغیر ہندوپاک کی اردو صحافت کے متعلق اس سے پہلے اور اس کے بعد شائع ہونے والی متعدد کتابوں کے خواص اس میں شامل ہیں گو اس کا فوکس مغربی دنیا میں شائع ہونے والے اردو اخبارات و جرائد پر ہے۔ بعض موازنوں سے اس کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ذہنی فضا وہی ہے جو'' کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کی ہے۔ اس کا اندازہ ان دونوں کتابوں کو کھولتے ہی ان میں درج انتساب کی عبارت سے ہی ہوسکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ'' کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کا مصنف حالات کی تپش میں جھلسا ہوا صحافی اپنے ہمسفروں کے کرب میں شریک ہے، دوسرا دور نزدیک سے مشاہدہ کرنے والا، مبتلائے آزار صحافیوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔

ایک اور موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کلکتہ میں اردو صحافیوں کی کیفیت اور ان کی حیثیت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے کم و بیش وہی کیفیت کراچی کے اخبار نویسوں کی تھی۔ تنخواہیں تقریباً ستر روپیہ ماہانہ سے شروع ہو کر ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ کے نقطۂ عروج تک، اس پر سے مالکانہ رعونت کا سامنا۔ اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ یہ سارا منظر جب برطانیہ منتقل ہوتا ہے تو بدلے ہوئے خارجی حالات میں ویسی ہی کھینچ تان، کاتبوں کی تحریک وغیرہ وغیرہ۔ مصنف نے اس کتاب کے تصنیفی نظام میں مولانا امداد صابری کی تصنیف'' اردو صحافت کی تاریخ'' کو سامنے رکھا ہے۔ اگر اس کتاب کو اپڈیٹ کر کے قاعدے سے اس کی اشاعت نو کی جائے تو افادیت اور بڑھ جائے گی۔ اس میں ہندوستانی اخبارات کی فہرست کے ساتھ ساتھ قابلِ ذکر صحافیوں کے تذکرے اور ان کی تحریروں کے نمونے شامل ہیں۔

ان ضمنی مشابہتوں کے باوجود ''اردو اخبارات ورسائل مغربی دنیا میں'' ایک بالکل مختلف اور اہم کتاب ہے جو مغربی دنیا میں اردو صحافت کی رسائی کی صرف خبر ہی نہیں دے رہی ہے بلکہ مکمل وقوف فراہم کرتے ہوئے مستقبل کی بشارتیں بھی دے رہی ہے۔ میڈیسن یونیورسٹی میں ڈاکٹر عمر میمن کی کاوشیں بڑی حوصلہ افزا اور ہمارے اس شدید احساس کی ترجمان ہیں کہ اردو زبان کے ادبی سرمائے کو یوروپین زبانوں میں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ ادب کی عالمی منڈی میں اس بحر ناپیدا کنار میں پوشیدہ گہر ہائے آبدار کی پرکھ ہو سکے۔ کناڈا اور امریکہ میں اردو ادب وصحافت کی رسائی اور سمائی کے اسباب اور کوائف بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح پنجاب کے کھیت مزدور وہاں کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی فصلیں اگا سکتے ہیں تو ذہنوں کی آبیاری کا سامان فراہم کرنے کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

اردو ماس میڈیا

''اردو ماس میڈیا'' ۱۹۹۳ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پروفیسر فضل الحق اس کے مرتب ہیں۔ اردو صحافت کی دنیا میں گوناگوں تجربات اور مہارتوں کی حامل پانچ شخصیات کے تحریر کیے ہوئے نو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ 'ترجمہ ایک فن' (سید ظفیر الحسن) جن کا تذکرہ کیا جاچکا ہے 'اسپیشل فیچر' اور انٹرویو اور پریس کانفرنس (کمال احمد صدیقی) 'اداریہ نویسی' (عشرت علی صدیقی)، 'ایجنسی رپورٹنگ' اور 'اشتہارات اور رابطہ عامہ' (شافع قدوائی)، 'کتاب کیا ہے'، 'مسودہ کیسے تیار کریں' اور 'پروف کی جانچ' (قیصر شمیم)۔

ایک جید صحافی اور مشہور وممتاز اخبار قومی آواز کے سابق ایڈیٹر عشرت علی صدیقی نے اپنے مضمون ''اداریہ نویسی'' میں موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن مجھے ایک بات کھٹکتی رہی۔ صدیقی صاحب نے ایڈیٹر کے اندر ایک بہت بڑی خوبی یا صلاحیت کا ذکر نہیں کیا۔ میرے خیال سے ''بصیرت'' ایک ایسی خوبی ہے جس کا حامل ہونا کسی ایڈیٹر کو واقعی رہنما بناتا ہے۔ بصیرت وہ خاصیت ہے جس کی بنا پر کوئی شخص مستقبل

میں دور تک دیکھ سکتا ہے، آنے والے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے پھر اپنی اسی چھٹی اور غیر معمولی حس کی روشنی میں قارئین کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ صرف زبان پر قادر ہونا، موثر پیرایۂ اظہار کا حامل ہونا یقیناً ایڈیٹر کے اندر ضروری صفات میں سے ہیں لیکن اگر بصیرت نہ ہو تو کسی اہم موقع پر کسی اہم مسئلہ پر اپنے قارئین کی صحیح رہنمائی کس طرح کر سکتا ہے؟

ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل کی زبان

''ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی یہ تصنیف ۱۹۹۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے مشمولات کے عنوانوں سے اس کی وسعت اور حدود کا اندازہ ہو جائے گا: ''ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ، اردو کا ارتقا، ترسیل کی زبان کی حیثیت سے، زبان تقریر سے تحریر تک، اردو نشریات کی زبان کا تجزیہ، اردو خبروں کی زبان کا تجزیہ، ریڈیو اور دور درشن کے پروگراموں میں اردو کا حصہ، اہم اردو پروگراموں کے مسودے اور ریکارڈ۔

یہ کتاب بڑی حد تک ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا احاطہ کرتی ہے۔ جہاں تک ٹی وی نشریات کا تعلق ہے اسے پچھلی صدی کے آخری عشرہ میں ابتدائی دور ہی کہنا چاہیے کیونکہ اس کے بعد کے دو عشروں میں ٹیکنالوجی کی ترقیاں اپنے ساتھ ساتھ زبان کو بھی آسمان کی بلندیوں کی طرف لیے جا رہی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے نشریاتی زبان کے فن کو جن بلندیوں تک پہنچا دیا ہے وہ بلاشبہ نشانِ راہ ہیں۔ انھوں نے ریڈیو نشریات کے حوالے سے بعض ادبی شہ پاروں کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ بذاتِ خود ایک چاشنی رکھتے ہیں اور ماضی کی دلآویز ادبی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

ابلاغیات

''ابلاغیات'' ڈاکٹر شاہد حسین کی تصنیف ہے۔ جس کے تین ایڈیشن دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں دوسرا ۲۰۱۶ء میں اور تیسرا ۲۰۱۸ء میں۔ اس

کتاب کو فن صحافت یا درس صحافت کا نصاب کہا جاسکتا ہے۔ یہ مطبوعہ اوراب تک کی نشری صحافت کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ترسیل وصحافت کی تعریف سے لے کر اس کی مرحلہ وار ترقیوں اور ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ارتقائی مرحلوں سے شناسا کرتی ہے۔ ۲۰۰۸ءتک ہندوستانی ٹیلی ویژن بحیثیت مجموعی تقریباً عالمی ترقیوں کے ہمدوش ہو چکا تھا اوراس عمل میں ان کے اردونشریات بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن جیسا کہ ہر علم میں ہوتا ہے کوئی واحد کتاب اس علم کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔کئی کتابیں مل کر اس ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں چنانچہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ، اخباروں اور صحافتی تحریروں کے حوالے دوسری متعلق کتابوں میں ملتے ہیں جہاں تک فن صحافت کا تعلق ہے ڈاکٹر شاہد حسین کی یہ تصنیف ایک مکمل نصاب ہے۔

اردو صحافت ترجمہ وادارت

''اردو صحافت ترجمہ وادارت'' سید ضیاء اللہ کی یہ تصنیف ۱۹۹۴ء میں بنگلور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مشمولات: صحافتی زبان، لفظ ومعنی کی صحت، محاورہ، روزمرہ، جملوں کی ساخت، رموز ووواوقاف، ترجمہ، ادارت، اداریہ نویسی، سرخیاں، پروف ریڈنگ، صفحوں کی تزئیں۔ان مضامین کے علاوہ آخر میں ضمیمے بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔جانوروں کی آواز، چند محاورے اوران کے مطالب، غلط لکھے جانے والے الفاظ، املا نامہ کی سفارشات، مذکر ومؤنث الفاظ، واحد الفاظ اوران کی جمع، ہندسوں کے نام، اردو میں مستعمل عربی الفاظ اوران کی جمع، آخر میں کتابیات میں شامل فہرست کتب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد لغات، فرہنگ اور قاموس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

صحافت خواہ مطبوعہ ہو یا نشریاتی زبان کی صحت تو پہلی شرط ہے لیکن یہ شرط ایسی ہے کہ صحافت سے متعلق کتابوں میں اس پر اصرار کم نظر آتا ہے۔ایک بات اور ہے وہ یہ کہ شمالی ہند کی صحافت میں شاید یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''، جنوبی ہند میں

کئی زبانوں کے خلط ملط ہوجانے کی وجہ سے شاید اس استناد پر شک ہو اس لیے سید ضیاء اللہ صاحب نے زبان کی اصلاح کی ضرورت پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے بعد مطبوعہ صحافت کے دیگر پہلوؤں پر حسبِ ضرورت روشنی ڈالی ہے، نشریاتی صحافت سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے، لیکن زبان کی اصلاح کی بنیادی ضرورت تو وہاں سب سے زیادہ ہے۔ یوں اب شمالی ہند کی صحافت کے کسی بھی پہلو کو دیکھیے تو زبان کی کیفیت ایسی ابتر ہوتی جارہی ہے کہ سند کا درجہ تو بہت دور کی بات ہے، قدم قدم پر اس کی درستگی ہی مشکوک ہوتی ہے۔

ہمارے وسیع وعریض ملک کے ہر خطے اور علاقے سے اردو اخبارات شائع ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہورہے ہیں۔ صرف سمجھنے سمجھانے کی غرض سے میں انھیں علاقائی اخبارات کہہ رہا ہوں۔ زبان کی بقا اور سارے ملک کو یکجہتی کی سلک میں پروئے رکھنے میں ان کی بڑی اہمیت اور بڑا اہم رول ہے۔ اسی طرح شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والی اردو صحافت سے متعلق تصنیفات کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں کسی شکل میں اکٹھا کردیا جائے تو بہت سارے تنوعات یکجا ہوجائیں گے مثلاً کسی کتاب میں صرف اخبارات کی فہرست سازی اور تاریخ اشاعت ہے کسی میں صرف مطبوعہ صحافت سے سروکار ہے، کسی کتاب میں نشریاتی یا الیکٹرانی صحافت کے اسرار و رموز ہیں، کہیں صحافت کے مختلف فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہیں زبان و بیان سے بحث ہے۔ غرض کہ اب تک اتنا کچھ لکھا اور شائع کیا جاچکا ہے کہ وہ آئندہ صحافیوں اور اس علم کے طالب علموں کی مکمل رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

حیدرآباد میں اردو صحافت

علاقائی صحافت سے متعلق تصنیفات سے بھی کہیں کہیں حیران کن معلومات حاصل ہوتی ہیں، مثال کے طور پر طیب انصاری کی تصنیف ''حیدرآباد میں اردو صحافت'' صرف حیدرآباد کے اخبارات کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ بھی ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک لیکن اس

سے تہذیبی منظر نامہ اور سیاسی اتار چڑھاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کتاب سے منکشف ہوا کہ ''مشیر دکن'' کشن راؤ نے ۱۸۹۲ء میں جاری کیا تھا جس کی اشاعت خواہ کسی حال میں سہی اب تک جاری ہے۔

''بازیافت'' (۲۰۰۵ء)، ''میڈیا روپ اور بہروپ'' (۲۰۰۶ء)، ''مغربی میڈیا اور اسلام'' (۲۰۰۸ء)، ''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' (۲۰۱۰)، یہ تصنیفات سہیل انجم کی ہیں۔ گوناگوں صحافتی مصروفیات کے باوجود ان کی تصنیفی کاوشیں بھی جاری ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ان کتابوں کے نام ہی سے ان کا تنوع ظاہر ہے۔

بازیافت

'بازیافت' صرف صحافت سے متعلق تصنیف نہیں ہے بلکہ اردو زبان اور اردو صحافت سے متعلق مضامین کے علاوہ دیگر مضامین اور شخصیات سے متعلق مضامین اس تصنیف میں شامل ہیں۔ اس کا اندازہ چند عنوانات سے ہوجائے گا: اردو کے مسائل اور ہم، نوجوان نسل اور اردو، اردو صحافت کے مسائل، اس کے بعد چند شعراء اور شخصیات کے تذکرے ہیں جو واقعی بازدید کا لطف دیتے ہیں۔ جو مضمون ''اردو صحافت کے مسائل'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے اس میں سہیل انجم نے ان سارے مسائل کی فہرست بندی کردی ہے جو اس فن، پیشہ اور صنعت کو درپیش ہیں جن پر الگ الگ بہتیری کتابیں موجود ہیں اور خود سہیل انجم اپنی اگلی تصنیفات میں ان مسائل سے الگ الگ نبرد آزما ہیں۔

میڈیا روپ اور بہروپ

ان کی اگلی تصنیف ''میڈیا روپ اور بہروپ'' ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اسی وجہ سے اس کو بہروپ کہا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں تین جید صحافیوں (سعید سہروردی، محفوظ الرحمٰن اور موہن چراغی) کے مضامین ہیں، اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا اندازہ چند مضامین

کے عنوانات سے ہوسکتا ہے: میڈیا اور ہمارا معاشرہ، نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل، میڈیا کا منفی رویہ، میڈیا اور خوف کی نفسیات، قومی پریس اور فرقہ واریت، گجرات فسادات میں میڈیا کا رول۔ اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً: الیکٹرانک میڈیا کی رسائی، نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن، ایس ایم ایس ایک انوکھا ذریعہ ترسیل، اس کے بعد آنے والے مضامین میں اردو صحافت سے متعلق امور پر گفتگو کی گئی ہے۔ اردو پریس اور جذباتیت، اردو صحافت کے مسائل پر طائرانہ نظر، قصۂ درد سناتے ہیں۔ یہی وہ درد ہے جس کی تپش میں میں جھلسا، پروانہ رودولوی آتش بہ جاں نظر آتے ہیں۔ ہماری ہی طرح سہیل انجم بھی اردو صحافیوں کی ناقدری اور انھیں اوران کی صحافت کو کمتر سمجھے جانے پر دل برداشتہ ہیں، لیکن ان صحافیوں کے درد کا مداوا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں آخری مضمون ''اردو کی اہم قابل ذکر ویب سائٹس'' اس کتاب کو منفرد بناتا ہے۔ یہ دلدادگان اردو اور اردو صحافت کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ اس مضمون کے لیے سہیل انجم نے یقیناً بڑی کاوش اور فلک پیمائی کی ہے اس کے لیے وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔

مغربی میڈیا اور اسلام

''مغربی میڈیا اور اسلام'' سہیل انجم کے اس سفر میں تیسرا پڑاؤ ہے۔ اس کتاب میں پہلے تین مضامین پروفیسر اختر الواسع، ابن احمد نقوی اور ڈاکٹر رضوان احمد کے ہیں اس کے بعد سہیل انجم کا دفتر کھلتا ہے۔ اس میں کیا کچھ ہے کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے۔ تینوں ابتدائی مضامین اور بقیہ ساری کتاب ایک ہی موضوع کے لیے وقف ہیں لیکن ان کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ چند عنوانات سے کیا جاسکتا ہے: میڈیا، مغرب اور مسلمان، مغرب اور اسلام، میڈیا اور اسلاموفوبیا، دہشت گردی کے معاملے میں دوہرا معیار، امریکی میڈیا اور مسلمان، برطانوی میڈیا کی مسلم کوریج، تہذیبوں کا ٹکراؤ اور میڈیا کا رول، میڈیا رپورٹنگ اور مسلم ردِعمل، امریکہ میں اسلام کا خاموش انقلاب۔

ظاہر ہے سہیل انجم کی اس تصنیف میں وہی کچھ ہے جو ایک عرصہ سے ہم میڈیا میں پڑھتے، دیکھتے اور سنتے آئے ہیں لیکن سہیل انجم نے دستاویزی حوالوں کے ذریعہ مغرب کی اسلام دشمنی کو ایک سند کی حیثیت دے دی ہے تاہم اس اسلام دشمنی کے باوجود اسلام کے مذہبی اور معاشرتی پہلوؤں کے متعلق مغرب میں جو تجسس پیدا ہوا ہے وہ مغرب کی عقلیت پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نتیجہ بھی سامنے ہے یعنی اعداد وشمار مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ساری مخالفتوں کے اندھیرے میں یہ روشنی کی کرن ہے۔ سہیل انجم کی اس رائے سے ہمیشہ میرا یہ خیال ہم آہنگ رہا ہے کہ اس پوری صورت حال میں ہماری کوتاہیوں کو بھی دخل ہے۔ ہم نے میڈیا میں معقولیت پسند حلقوں کی نہ تو بخوبی نشاندہی کی ہے نہ ان سے ربط ضبط بڑھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مخالف میڈیا کے طوفان میں ہم اپنا دیا نہیں جلا سکتے تو تھوڑے سے معقولیت پسندوں سے ربط ضبط بڑھانا بہترین متبادل ہے۔

میڈیا، اردو اور جدید رجحانات

''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' یہ سہیل انجم کی اگلی تصنیف ہے۔ یہ دو ابتدائی مضامین کے علاوہ تین ابواب پر مشتمل ہے: میڈیا، ایک صورت ہزار جلوے، میڈیا اور اردو، میڈیا اور مسلم معاملات۔ ان تین ابواب میں ۲۷ مضامین ہیں، ابتدائی دو مضامین میں سے پہلا مضمون پروفیسر شافع قدوائی کا ہے۔ دوسرا مضمون میرا ہے جس کا عنوان ہے: ''اردو صحافت کا منظرنامہ''۔ جی تو چاہتا ہے کہ سہیل انجم کی اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اسی مضمون کو نقل کردوں لیکن خوفِ طوالت مانع ہے، اس لیے کچھ اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

میڈیا ایک بحرِ بیکراں ہے، جس کی حدیں ہر روز نہیں، ہر لمحہ وسعت پذیر ہیں۔ سہیل انجم اس بحرِ ناپیدا کنار کے شناور ہی نہیں، ایسے غواص ہیں جو وقفے وقفے سے معلومات کے گہرہائے آبدار لے کر نمودار ہوتے ہیں۔

ان کی اس تصنیف کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں اور عصری میڈیا کے رشتوں کو سمجھنا سمجھانا ہے۔ اس تصنیف کی معنویت اور اس کے مضمرات اسی اجمال کی تفصیلات ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے ہم اس کو تین ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول ہم عصر میڈیا، دوم اردو یا مسلم صحافت، تیسرے الیکٹرانک میڈیا۔ جہاں تک ہم عصر میڈیا کا تعلق ہے اس میں زبانوں کی کثرت، نظریات کے اختلافات اور تنوعات اور مسلمانوں کے تئیں ان کے مختلف اور متضاد رویوں کی وجہ سے ان کا مختصر تجزیہ بھی خاصا مشکل اور عام قاری کو الجھانے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس تصنیف میں شامل کئی مضامین مثلاً ہم عصر میڈیا اور رجحانات، قومی میڈیا اور مسلمان، دہشت گردی، مسلمان اور میڈیا اور اس سلسلے کے دیگر مضامین کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ فی الحال اشارتاً کہا جا سکتا ہے کہ سہیل انجم نے مختلف اخبارات ونشریات کے حوالے سے اور متعدد مستند اور معتبر صحافیوں کے انٹرویوز کے ذریعہ ان غلط فہمیوں کو اجاگر کیا ہے جو ہم عصر میڈیا میں مسلمانوں کے تئیں موجود ہیں۔ مثلاً دہشت گردی کے تئیں عام مسلمانوں کا نرم رویہ یا اردو صحافت، بہ الفاظ دیگر مسلم صحافت کا محض احتجاجی ہو کر رہ جانا۔ سہیل انجم نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

انٹرویوز سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعتدال پسند صحافی میڈیا کے ہر شعبہ میں موجود ہیں وہ مسلمانوں کے مسائل اور حقیقتِ حال کو جاننے کے خواہشمند بھی ہیں لیکن انھیں نہیں معلوم کہ وہ یہ کام کیسے کریں۔ انھیں بہر حال مسند نشینوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ اتنی ہی بات اس ضرورت پر زور دینے کے لیے کافی ہے کہ مخلص صحافی سامنے آئیں عصری میڈیا میں کھلے ذہن کے لوگوں کو تلاش کر کے ان سے مستقل رابطے میں رہیں اور ان کے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں۔ یہ وقتی نہیں مستقل اور مسلسل عمل ہے۔

سہیل انجم نے مدارس سے شائع ہونے والے جرائد کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ ان کی آمدنی کے محدود وسائل کی طرف اشارے کیے ہیں

اورانھیں اپنی اشاعتوں کو زیادہ بہتر اور مفید بنانے اور آمدنی کے وسائل دریافت کرنے کے ضمن میں مفید مشورے دیے ہیں، اس کے ساتھ ہی ان رسالوں کی ذہنی آبیاری کرنے والوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رسائل کی رسائی دور دور تک ہے اور عوامی ذہن پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے، اس لیے میڈیا کی پیدا کی ہوئی اور پھیلائی ہوئی بہت ساری خرابیوں کی اصلاح کا یہ بہترین ذریعہ ہیں، اس بیش بہا اور مؤثر وسیلے کو بھرپور استعمال کیا جانا چاہیے۔

ایک اور سوال اکثر کیا جاتا رہا ہے کہ اردو صحافت کس کی ہے؟ اس کا صاف اور سیدھا جواب تو یہی ہے کہ جو اس صحافت کا قاری، سامع، ناظر یا مخاطب ہے یہ صحافت اسی کی ہے۔ لیکن اس سوال کی رمزیت بڑی تکلیف دہ ہے کیونکہ قومیت یا زبان کی مذاہب کے خانوں میں تقسیم کا تصور تکلیف دہ اور ناقابلِ قبول ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب نے اردو کے مال متاع کو ہر جامے میں فٹ کرنے کے ناممکن عمل کو ممکن بنادیا لیکن اس بظاہر عمل مساوات نے اردو زبان وادب اور صحافت کی داخلی کشاکش کو کم کرنے کے بجائے بڑھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہی خواہان اردو کی تشویش میں بھی اضافہ کردیا ہے۔ اس کی تفصیلات اور اس صورتِ حال کے مقابلے اور اصلاح کی کوششوں کی طرف سہیل انجم کی موجودہ تصنیف میں اشارے موجود ہیں، اس سلسلے میں زبانی جمع خرچ کے بجائے مسلسل پرخلوص اور صدق دلانہ عمل کی ضرورت ہے۔ ابھی بلا تکلف کہہ دینا چاہیے کہ اس کا بار صحافیوں اور اردو اساتذہ کو ہی اٹھانا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ کارِ خیر جسے بہرحال ہونا ہے قدرت ان کے ہاتھوں سے لے کر کسی اور کو سونپ دے گی اور وہ اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ آج وہ سنگین حقیقت ہمارے سامنے ہے۔

اردو پریس کے پس منظر میں جب ترجمہ کی بات ہوتی ہے تو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ اخبارات صرف ترجمہ کے مرہونِ منت ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں خبر

رسائی کا عمل روزِ اول سے ترجمہ کی معرفت ہوتا رہا ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کی ضرورت اردو صحافت کے دفاع میں پیش آئی ہے۔لیکن آج ہندوستان میں اردو زبان کو اسی ترجمہ سے نئے خطرے لاحق ہیں۔قصہ یہ ہے کہ اردو کی حیثیت سے ہزار انکار کے باوجود یہ وہ جادو ہے، جو ہندی کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ چنانچہ میڈیا ہو فلم یا ابلاغِ عامہ کا کوئی شعبہ وہاں ہندی زبان کا استعمال کرنے والے اپنی زبان کی زیبائش کے لیے اردو سے کچھ پر لے کر اپنی کلغی میں الٹے سیدھے کی تمیز کیے بغیر ٹھونس لیتے ہیں اور ''مخالفت'' کو ''خلافت''، ''تفصیل'' کو ''خلاصہ'' کہنے لگتے ہیں۔مثالیں اور بھی ہیں۔ یہ ہماری زبان کی خطرناک تخریب ہے اور اس کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اردو والے اپنی بے عملی یا کام چوری کی بنا پر ان بگڑی ہوئی شکلوں کو ہی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔یعنی ہندی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرتے صرف رسم الخط بدل دیتے ہیں۔ اس باب میں اردو میڈیا کے اربابِ اقتدار کو سخت گرفت اور سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اردو صحافت کا سفر

''اردو صحافت کا سفر'' (۲۰۰۷ء) نئی دہلی: گربچن چندن کی یہ تصنیف ۱۹ر مضامین پر مشتمل ہے اور پونے چار سو صفحات پر محیط ہے۔ کتاب کا ٹائٹل ہی اس امر کا غماز ہے کہ اردو صحافت کا سفر، ترقی کی طرف جاری ہے۔ یہ کتاب معلومات کا خزانہ تو ہے ہی خاص بات یہ ہے کہ بہت ساری معلومات دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں جو شواہد کے حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ یہ کام چندن صاحب ہی کے بس کا تھا۔حکومت ہند کے انفارمیشن بیورو میں ۳۲ برس تک خدمات نے انھیں جو موقع فراہم کیا تھا وہ دوسروں کو نصیب نہ تھا پھر یہ کہ چندن صاحب نے اس موقع سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور نہایت مخلصانہ کاوش کے ذریعہ بیش بہا اور نایاب معلومات کو قارئین تک پہنچایا۔

ایسی ہی ایک مثال کلکتہ میں ملتی ہے۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ حکومت مغربی بنگال

کے شعبہ اطلاعات سے وابستہ تھے، انھوں نے مولانا آزاد کے پاسپورٹ کے بارے میں خفیہ اطلاعات کی فائل کو نیشنل آرکائیوز میں دیکھا اور اس کو منظرِ عام پر لائے۔ یہ غیر معمولی موقع ہر کسی کو نصیب نہ تھا۔ انھوں نے ''بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ'' بھی رقم کی۔ بعد میں مغربی بنگال اردو اکادیمی نے رئیس احمد جعفری کی نظر ثانی اور قدرے اضافے کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت ثانی کی اس طرح گزشتہ صدی کے آخری عشروں میں کلکتہ کے کارکن صحافیوں کے کچھ احوال بھی اس میں شامل ہو گئے۔

چندن صاحب کی کتاب کے ابتدائی دو مضامین میں سے ایک عبدالباری مسعود کا ہے اور دوسرا مضمون ڈاکٹر عقیل احمد کا ہے جو ۳۰-۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مبسوط مضمون کو ایک طرح کتاب کا خلاصہ کہنا چاہیے۔ یہ مضمون قاری کو مہمیز کرتا ہے کہ وہ جہاں سے چاہے تفصیلات کو پڑھ لے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے۔ پہلا حصہ ''چراغ جلے اجالا'' کے زیرِ عنوان آزادی سے پہلے تک کی اردو صحافت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ذیل میں چند عنوانات سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ برصغیر میں مطبوعہ اردو صحافت کی ابتدا۔ پہلے پریس ایکٹ کا محرک 'جام جہاں نما' تھا، اردو صحافت ۱۹۴۰ء میں، تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ، اردو صحافت اور قومی یکجہتی۔

دوسرے حصے کا عنوان ''نیا سویرا'' ہے۔ اس کے تحت چند مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں: عصری اردو صحافت اور مسائل، ہندوستان میں اردو صحافت، اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں، اردو صحافی آج کیا کرے، آخر الذکر موضوع کے تحت اردو صحافیوں کے لیے کچھ اشارے کیے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اس ضمن میں چندن صاحب نے سرسید احمد خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور حسرتؔ موہانی کی اور ان کی صحافتی کاوشوں کی مثالیں پیش کی ہیں، لیکن آج اردو اور اردو صحافت کو خصوصاً مسلم صحافت کو جو مسائل درپیش ہیں وہ محولہ بالا سارے حالات سے مختلف ہیں۔ پہلے دور میں

حکومت کی مشنری اردو زبان اور صحافت کے تیئں غیر متعصب اور غیر جانبدار تھی اب ایسا نہیں ہے۔ شرارت پسند اور تخریبی عناصر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے بے خوف گھومتے ہیں، ان کا مقابلہ کرنا قلم کاروں کے بس کی بات نہیں، اس طرح بالکل بدلے ہوئے حالات میں نئی بصیرتوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک اردو صحافت کے مستقبل کا تعلق ہے چندن صاحب نے جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے وہ بالکل بجا ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی تصنیف منفرد ہے۔

ایک اور ایسی کیفیت ہے جو مصنف اور تصنیف دونوں کو سب سے مختلف اور منفرد بناتی ہے وہ یہ کہ چندن صاحب کو آزادی سے پہلے اردو صحافت کے ایک بڑے مرکز لاہور کے کوائف کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، اس کے بعد دہلی کی صحافتی جولانگاہ میں عمر گزاری۔ یہ موقع نہ مولانا امداد صابری کو نہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو نہ کسی اور کو حاصل ہوا۔

آخری بات جو میری اس تحریر کی محرک ہوئی اور اس مضمون کے آغاز میں ہی بیان کی گئی ہے وہ ہے آزادی کے بعد اردو صحافیوں کی ابتلا و آزمائش جس کی تپش سے میں سلگتا رہا اور پروانہ صاحب سرتاپا شعلہ صفت رہے۔ اس کی طرف بھی چندن صاحب نے صرف اشارے کیے ہیں، سرکاری مشنری کے ایک پرزے کی حیثیت میں اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ پریس کمیشن کی سفارش کے مطابق جو اجرتی بورڈ بنا تھا اس کی ایک ذیلی کمیٹی اردو پریس کے متعلق تھی، جس کے سربراہ ڈاکٹر محمد علیم صاحب تھے وہ کمیٹی کلکتہ بھی گئی تھی، اس کے ایک رکن عابد علی خاں صاحب، ایڈیٹر روزنامہ سیاست، حیدرآباد نے صرف ایک دو مالک ایڈیٹروں سے ملاقات کی کسی اردو ورکنگ جرنلسٹ سے مل کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس پر کیا گزر رہی ہے، اس کو بھی کچھ کہنا ہے یا نہیں۔

میں نے اپنی کتاب کے آخر میں ایک انڈکس دیا ہے جس میں وہ سارے نام شامل ہیں جن کا کتاب میں ذکر آیا ہے۔ اس طرح ایک حوالے کے طور پر اس کتاب کی

افادیت بڑھ جاتی ہے جو اور کسی کتاب میں نظر نہیں آتی۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کلکتہ اردو پریس کا قاری دوسرے علاقوں سے کسی قدر مختلف تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی ہند کے بہت سے لوگ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے اور یہ کوئی وقتی عمل نہ تھا بلکہ آمد و رفت کا ایک سلسلہ تھا جو رک رک کر جاری رہتا تھا۔ آزادی کے پندرہ بیس سال بعد تک اس پورے خطے میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ اس لیے وہ مستقلاً مضطرب اور پریشان رہتے، انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے ایسے میں اخبارات ان کی رہنمائی کے لیے کیا کرتے۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد اس طرف اردو واخبارات بند ہوگئے۔ ہم لوگوں نے سنا تھا کہ کلکتہ کے کچھ اخبارات اس طرف بھی چلے جاتے ہیں لیکن ظاہر ہے اس طرف کے پڑھنے والوں کی رہنمائی کا کوئی سامان ان اخباروں میں نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر کچھ ممکن تھا تو صرف دونوں طرف امن و آشتی کی تمنا۔ گویا کلکتہ اردو پریس کے قاری کی ایک تعداد غیر مستحکم تھی مزید یہ کہ بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کے مسائل و معاملات کو بنگلہ پریس ایڈریس نہیں کرتا تھا۔ یہ فریضہ بھی اردو اخباروں کو ہی نبھانا تھا چنانچہ کلکتہ اردو پریس کے قاری نے اس کو غیر معمولی حالات سے دوچار کر رکھا تھا اور وہ ان حالات سے جس طرح نمٹ رہا تھا اس کا تذکرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے اپنی تصنیف میں اس کو بیان کیا۔ مزید یہ کہ ۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی کے دوران ملک بھر کے صحافیوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس میں کلکتہ کے اردو صحافی پہلے دو بار مبتلا ہو چکے تھے۔ ایک ۱۹۶۲ء کی ہند-چین جنگ کے دوران دوسرے ۱۹۶۵ء میں ہند-پاک جنگ کے دوران۔ ان تجربات نے کلکتہ اردو پریس کے ذمہ داروں کو زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔

موضوع کے اعتبار سے یہ مضمون بالکل ناکافی ہے اور صرف اشارے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے رہنا بہتر ہے۔

◈◈◈

اکیسویں صدی میں اردو صحافت

نام کتاب : اکیسویں صدی میں اردو صحافت
مصنف : ڈاکٹر امام اعظم

اب عام طور سے صحافت کے بجائے میڈیا کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی ہے جس میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو تو شامل ہوتا ہی ہے ''سوشل میڈیا'' کے نام سے جو چیز وبائی شکل اختیار کرتی جارہی ہے اس کو بھی میڈیا کا حصہ ہی تصور کرنا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں انٹرنیٹ کو بھی اس میں شامل کیا جانا چاہیے کیونکہ بہت ساری چیزیں انٹرنیٹ سے حاصل کر کے انھیں ضرورت کے مطابق میڈیا میں استعمال کیا جارہا ہے اوران اجزاء کو خاصی معتبریت حاصل ہے۔ اس تمہید سے میری غرض اپنے اس خیال کا اظہار کرنا ہے کہ اردو صحافت کے بجائے اردو میڈیا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب تک اردو صحافت صرف اخبارات تک محدود تھی اس کو صحافت کہا جاتا رہا لیکن اب تو ٹی وی پر اردو پروگرام آتے ہیں کئی اردو چینل ہیں، انٹرنیٹ پر اردو سائٹس موجود ہیں۔ الکٹرانی میڈیا میں جو طریقہ کار زیرِ استعمال ہیں جنھیں اصطلاح میں ''ایپ'' کہتے ہیں وہ سب اردو میڈیا میں بھی کارآمد اور زیر استعمال ہوتے جارہے ہیں۔ اخبارات اور رسالے تو بہت عرصہ سے انٹرنیٹ پر موجود ہیں اب آن

لائن مطبوعات بھی آتی جا رہی ہیں۔ مزید براں وہ مضامین اور کتابیں ہیں جو میڈیا کے فنی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک اردو صحافت سے متعلق تصنیفات صرف مطبوعہ صحافت کا احاطہ کیا کرتی تھیں ان میں اکثر و بیشتر میں مطبوعات اور مدیران کی فہرست سازی ہوا کرتی تھی۔ ان تمام ترقیوں اور مجموعی حالات کے پیشِ نظر جن میں جدید ٹیکنالوجی کو کمال مہارت کے ساتھ استعمال کرنے والے صحافیوں کی روز افزوں تعداد بھی شامل ہے مناسب ہوگا کہ اب ہم اردو میڈیا کی بات کریں۔

چنانچہ اردو میڈیا سے متعلق ایک تازہ تصنیف ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی یہ تصنیف کلکتہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی میرے اس خیال کی ایک بار اور تصدیق ہوگئی کہ اب اردو صحافت کی زندگی یا موت کی باتیں کرنی فضول ہیں۔ اب اس میڈیا کی پہنائیوں کی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس تصنیف میں بہت کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کتاب میں دو درجن سے زیادہ مضامین تقریباً اتنے ہی لکھنے والوں کے شامل ہیں اس لیے ڈاکٹر امام اعظم خود کو اس کتاب کا مصنف کہنے کے بجائے مرتب کہنے میں حق بجانب ہیں۔ مضامین کے تنوع کا اندازہ محض چند مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''ادبی صحافت کا عصری منظرنامہ'' (حقانی القاسمی) ''اردو صحافت کا منظرنامہ'' (ڈاکٹر شاہد الاسلام) ''ہندوستان کے دینی مجلّات کی صحافت'' (سہیل انجم)، ''اردو صحافت اور روزگار'' (نور الصباح)، ''کولکاتا میں اردو صحافت'' (ڈاکٹر امام اعظم) اسی طرح بہار، جھارکھنڈ، متھلا اور یوپی کے صحافتی منظرنامہ پر مضامین ہیں۔ مزید براں نصف درجن مضامین صحافت کے ٹیکنیکل پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ یہ وہی پہلو ہیں جو میرے خیال سے اردو صحافت کو اردو میڈیا بناتے ہیں۔ مثلاً ''اردو تحقیق اور انٹرنیٹ'' (پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی)، ''اردو وکی پیڈیا ایک جائزہ'' (ڈاکٹر امام اعظم)، ''سوشل میڈیا صحافت کی نئی معراج'' (شاہد اقبال) وغیرہ۔

اردو اخبارات کے عروج و زوال کی کہانی لمبی ہے اور مختلف ادوار میں اس کے اسباب مختلف رہے ہیں اسی کے تذکرے کے لیے ایک مکمل کتاب درکار ہے اور یہ ایسا مبسوط اور پیچیدہ موضوع ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس کی جسارت کرے لیکن اگر کبھی جزوی طور پر لکھا گیا تو وہ یقیناً چشم کشا ہوگا اور اسی کو پڑھ کر یقیناً کچھ دل بھر آئیں گی اور کچھ آنکھیں بھر آئیں گی۔ بہرحال جس قدر اردو اخبارات و رسائل اس وقت شائع ہو رہے ہیں اور جس طرح چینلوں پر اردو سوار ہے وہ کافی حوصلہ افزا ہے۔ کچھ عرصہ سے اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تصنیفات جس کثرت اور تواتر سے آرہی ہیں وہ بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

اس تصنیف کے چند مضامین کا سرسری جائزہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ ''ادبی صحافت کا عصری منظر نامہ'' حقانی القاسمی کے قلم سے بہت خوب اور معلومات افزا ہے۔ انھوں نے ''عصری'' کا اضافہ کرکے بڑی زحمتوں سے جان چھڑا لی ہے۔ صحیح بھی ہے۔ ماضی کا بوجھ کب تک اور کہاں تک ڈھوتے پھریں لیکن کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے ''کولکاتا (کلکتہ) کی اردو صحافت'' کے عنوان سے اپنی تحریر میں ماضی و حال کی تقسیم سے گریز کرتے ہوئے وہاں سے شائع ہونے والے تقریباً سارے نئے پرانے اخبارات و رسائل کی ایک جامع فہرست پیش کی ہے، یوں چھوٹی موٹی فروگزاشتیں ہمیشہ اور ہر جگہ ممکن ہوتی ہیں مثلاً ''کارواں'' اور ''نقاش'' کے مدیر یونس نظری کے قریبی دوست عبدالجبار جابر فیروز پوری اسی زمانے میں ماہنامہ ''نباض'' اور ہفتہ وار ''ایشیا'' نکالا کرتے تھے جس کا اداریہ میں ہی لکھتا تھا۔ امام اعظم کی تحریر میں اس انکشاف سے کہ ستمبر ۱۹۵۱ء میں مظہر امام کلکتہ آئے تھے مجھے ایک نامعلوم سی خوشی محسوس ہوئی کہ نو واردان کلکتہ میں ان سے میں تین چار مہینے سینئر تھا، میں جون ۱۹۵۱ء میں کلکتہ آ گیا تھا، اس سے پہلے بھی مختصر قیام کر چکا تھا۔ امام اعظم نے بہار، جھارکھنڈ وغیرہ کے اخبارات و رسائل کو بھی شامل

کر کے اپنے مضمون کو وسیع تر بنا دیا ہے۔ ذاتی طور پر میں ڈاکٹر امام اعظم کا مشکور ہوں کہ کلکتہ میں کسی نے کسی تحریر میں میری بدقسمت کتاب ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کا تذکرہ تو کیا حالانکہ کئی لوگوں کو میں نے وہ کتاب بھیجی تھی، مغربی بنگال اردو اکادمی کو بھی دو جلدیں بھیجیں لیکن بالکل سناٹا رہا۔ یہی حشر میری دوسری کتاب ''اوراقِ مصور'' کا ہوا جو کہ کلکتہ کے ماضی وحال کی منظوم تاریخ ہے۔ کلکتہ کی منظوم تاریخ پر ''تمثیل نو'' کے ایک خصوصی شمارہ کا ذکر بھی ہے۔ معلوم نہیں اس میں بھی اس کتاب کی کوئی خبر ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ دونوں کتابیں میری دوسری کتابوں اور مضامین کے ساتھ میری ویب سائٹ www.Rizwanullah.com پر موجود ہیں۔

کلکتہ کے متعلق دو مضامین اور زیرِ نظر تصنیف میں موجود ہیں ایک ڈاکٹر نصرت جہاں کا مضمون ''مغربی بنگال کی اردو صحافت میری نظر میں'' ہے اور دوسرا مضمون ''اردو صحافت اور روزگار'' نور الصباح کا ہے۔ نصرت جہاں کلکتہ کی صحافت سے متعلق کسی کتاب کی تصنیف کر رہی ہیں۔ دریں اثنا چند چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتا دوں ''آبشار'' عام طور سے کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان سمجھا جاتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سالکؔ لکھنوی جو ایک کارخانے کے مالک سرمایہ دار تھے مگر نظریاتی طور پر کمیونسٹ تھے، وہ ''آبشار'' کے مالک اور ابراہیم ہوشؔ کے ساتھ اس اخبار کے مشترک ایڈیٹر تھے۔ معین صاحب ان کے اقارب میں سے تھے اور وہ آبشار کے منیجر تھے۔ ابراہیم ہوشؔ کا معاملہ یوں تھا کہ ابتداً وہ احمد سعید ملیح آبادی کے ساتھ ''آزاد ہند'' کے مشترک ایڈیٹر تھے۔ غالباً مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ایما سے ایسا ہوا ہوگا لیکن شاید ۱۹۵۲ء میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہوگیا اور ہوشؔ صاحب الگ کر دیے گئے، اس کے بعد سالکؔ صاحب سے مل کر انھوں نے ''آبشار'' نکالا۔ جس سے وہ آخر دم تک وابستہ رہے۔

ایک اور ضروری بات یہ کہ میں ''آزاد ہند'' میں صرف مترجم نہیں تھا۔ نیوز ایڈیٹر

تھا، ایڈیٹوریل رائٹر تھا۔ ''عصرِ جدید'' کے مینجمنٹ سے میرا جھگڑا اسی بات پر تھا کہ وہ حاضری رجسٹر میں میرے نام کے سامنے مترجم لکھتے تھے۔ میں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ میں عرصہ دراز سے وہاں نیوز ایڈیٹر تھا اگر انھیں یہ منظور نہیں تھا تو کم سے کم سب ایڈیٹر ہی لکھ دیتے لیکن اتنا اعزاز بخشنا بھی انھیں گوارا نہیں تھا۔ بالآخر ۱۸ سال کی خدمات سے صرفِ نظر کرکے مجھ پر ''عصرِ جدید'' کے دروازے بند کردیے گئے۔ ''آزاد ہند'' میں تو بڑے نازک وقتوں میں ایڈیٹوریل لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر آپڑی تھی۔ مثلاً بنگلہ دیش کی تشکیل کے ہنگامے کے دوران اس وقت احمد سعید صاحب اپنے وطن ملیح آباد چلے گئے تھے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں اردو ایڈیٹروں کے ساتھ حکومت نے جو سلوک کیا تھا اس کے پیشِ نظر ان کا ایسا کرنا ایک طرح کی دانشمندی تھی لیکن ہم تو منجدھار میں تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کردیا تو احمد سعید صاحب نے اپنا لکھا ہوا ایڈیٹوریل واپس لے لیا اور مجھ سے کہا کہ تم لکھو، میں نے لکھا۔ لیکن اس طرح اخبار اور ایڈیٹر سب ایمرجنسی کی زد سے بچ گئے، جس کا اعتراف سعید صاحب ہر موقع پر کرتے رہے۔ یہ ساری باتیں میری کتاب میں موجود ہیں غالباً میری وہ کتاب نصرت جہاں کے پاس ہوگی۔ ایک ضمنی بات بھی اسی جگہ لکھنا چاہتا ہوں: ''پیش بینی اور دور اندیشی کامیاب صحافت کے جوہر ہیں۔''

دوسرا مضمون ''اردو صحافت اور روزگار'' نور الصباح کا ہے۔ ان کی کئی باتوں کا جواب میری کتاب ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں موجود ہے۔ کلکتہ کے اردو صحافیوں نے اپنی انجمن بنائی تھی جس نے بعض صحافیوں کی مشکل وقتوں میں مدد بھی کی لیکن وہ بہت جلد ذاتی چپقلشوں کی نذر ہوگئی۔ انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی مغربی بنگال شاخ موجود تھی اور پریس کمیشن کی رپورٹ کے بعد کافی فعال بھی ہوگئی تھی۔ میں خود اس کا ممبر تھا۔ اس کی اکزیکیوٹیو کمیٹی کا بھی ممبر رہ چکا تھا۔ اخبار نویسوں کو بہکانے اور اردو اخباروں میں ہڑتال

کرانے کی بے بنیاد تہمت بھی مجھ پر لگائی گئی۔ اس کم ظرفی سے بد دل ہو کر میں نے ایسوسی ایشن کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت میں آزاد ہند سے وابستہ تھا اس سے بھی علیحدہ ہونا چاہا لیکن سمیع اللہ اور منیر نیازی مجھے پکڑ کر دوبارہ ''آزاد ہند'' لے گئے۔ میں نے ان سارے واقعات کا تفصیل سے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے لیکن اس بدنصیب کتاب کا کلکتہ میں کہیں ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ میں نے بہتیرے لوگوں تک اس کتاب کو پہنچایا ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق کتابیں تواتر کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا بات اردو زبان و ادب کے بے پناہ ذخائر کو انٹرنیٹ کے ذریعہ ارض و سما کی وسعتوں میں پھیلا دینے کا عمل ہے۔ اس طرح ہماری یہ بیش بہا متاع زمانے کی دست برد اور شکست و ریخت سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس ساری کارروائی کے لیے متعلقہ ٹیکنالوجی اور اس کے استعمال کرنے کے نت نئے عوامل کو ایجاد کرنے والوں کے ہم ممنون احسان اور شکر گزار ہیں لیکن اس کے بعد اس سے استفادہ کے طریقوں کو جاننا بھی تو ضروری ہے، اس کے بغیر تو سارے کا سارا کیا دھرا بے کار اور بے سود ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے آخری نصف درجن مضامین میں یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہماری متاع گم گشتہ کن کن نہاں خانوں میں محفوظ ہے اور اس کی کلید کہاں ہے کہ جس سے اس خزانے کو کھول کر روح کی تازگی اور دماغ کی روشنی کا سامان کر سکیں۔ یہ مضامین ہیں: ''اردو تحقیق اور انٹرنیٹ'' (پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی)، ''اردو زبان اور ادب انٹرنیٹ کے دوش پر'' (ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز)، ''ادب و ثقافت کے فروغ میں انٹرنیٹ کا کردار اور اردو'' (احمد جاوید)، ''اردو وکی پیڈیا ایک جائزہ'' (ڈاکٹر امام اعظم)، ''سوشل میڈیا صحافت کی نئی معراج'' (شاہد اقبال)، ''اس کتاب میں کتابیات کیوں؟'' (ڈاکٹر حیدر علی) یہی مضامین اس کتاب کی حقیقی افادیت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ انہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ پر کیا کچھ ہے اور کس طرح

حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر حیدرعلی نے صحافت سے متعلق اردو کتابوں کی ایک مبسوط فہرست دے کر اس کتاب کی افادیت میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ اس فہرست میں ۸۶ کتابیں شامل ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سہیل انجم کی کوئی نصف درجن کتابوں میں سے صرف ایک اس فہرست میں شامل ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اور بھی کئی کتابیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک تکمیلی عمل کا تسلسل ہے اور اضافوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ایک تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے ص ۲۹۳ پر ''کاروانِ صحافت'' کے مصنف کا نام ''عبدالسالم خورشید'' لکھا ہوا ہے۔ میرے خیال سے ان کا صحیح نام ''عبدالسلام خورشید'' ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۶۰ء والے عشرے میں ان کی ایک کتاب ''صحافت پاکستان و ہند میں'' شائع ہوچکی تھی جو دراصل ۱۹۵۵ء میں شائع ہونے والی جے نٹراجن کی تصنیف ہسٹری آف انڈین جرنلزم کا چربہ یا ایک طرح کی جوابی کارروائی تھی کیونکہ ۱۹۵۰ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ صحافت تو ایک ہی ہے۔ ذاتی طور پر مجھے خوشی ہے کہ اس فہرست میں میری تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' شامل ہے گو اس کا پتہ غلط لکھا ہوا ہے۔ اس کا پتہ ہے: ڈی-۱۷۸، ابوالفضل انکلیو (نہ کہ شاہین باغ)، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵۔

اب ایک اور موضوع - اردو صحافت پر تو بہتری زیبا اور نازیبا تہمتیں لگائی جاتی رہی ہیں، جیسے کہ صرف ترجمہ پر اس کا انحصار، مالی اعتبار سے کمزور، پسماندہ لوگوں کا اخبار، سرقے کا مرتکب وغیرہ گویا بقیہ ساری صحافتیں، اب میڈیا کہہ لیجیے، ان کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہیں۔ اب اس کتاب میں سید ایاز احمد روہوی کے مضمون ''اردو میں زرد صحافت'' میں ساری اردو صحافت ہی کو بھگوا رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ یعنی زرد صحافت قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ مضمون میں ''زرد صحافت'' کی جڑیں انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ میں بتائی گئی ہیں پھر دنیا بھر کے میڈیا میں اس کے پھیلاؤ کے تذکرے ہیں۔ اس

کے بعد اچھی صحافت کے اصول بیان کیے گئے ہیں لگے ہاتھ مضمون کے عنوان کی رعایت سے کچھ چھینٹے اردو صحافت پر بھی اس طرح اڑا دیے گئے ہیں گویا اردو صحافت میں سنجیدگی کا وجود ہی نہیں۔ حیران ہوں کہ اس بارے میں کیا لکھوں۔

زرد صحافت اور اردو اخباروں میں شائع ہونے والے طنز و مزاح کے مضامین یا کسی کسی اخبار میں اس نوع کے مستقل کالم ان دونوں میں بڑا فرق ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح کے تفریحی مضامین یا خصوصی کالم ایک طرح سے فرحت کا سامان فراہم کرتے تھے اور پریشان کن خبروں کی بھرمار سے ایک طرح کا گریز تھا۔ یہ اردو اخبارات کی خصوصیت تھی اب بھی کہیں کہیں باقی ہے۔ مثال کے طور پر نصرت ظہیر کا زیادہ طنزیہ، مزاحیہ کالم جو پہلے راشٹریہ سہارا میں ہوا کرتا تھا اب انقلاب میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک پڑھنے کی چیز ہے وہ نئی نئی اصطلاحات گڑھتے ہیں، نئے نئے الفاظ و محاورات سے متعارف کراتے ہیں۔ پوری تحریر میں بڑی ندرت ہوتی ہے۔ اس طرح کے کالم لکھنا بہت مشکل ہے۔ ایڈیٹوریل سے بھی زیادہ مشکل۔ ان تحریروں میں کبھی کبھی ایسی چٹکیاں ہوتی ہیں کہ متعلق شخص اس کی جراحت سے بے چین ہو جاتا ہے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پھر ایسی تحریروں کا مستقل کالم کی صورت میں وقت معین پر لکھنا بڑے کلیجے کا کام ہے۔ یہ تو کوئی مجتبیٰ حسین سے پوچھے۔ یہی کام انگریزی صحافت میں کارٹونوں سے لیا جاتا ہے۔ لافانی لکشمن کے کارٹون جس نے دیکھے ہوں گے وہ جانتا ہوگا۔ کسی کسی اور کبھی کبھی انگریزی اخباروں میں بھی بڑے دلچسپ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین آتے ہیں۔ اس طور کے مضامین کے لیے زبان پر بڑی قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اردو اخباروں میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ اس بے تکلفی میں بعض لکھنے والے تجاوز کر گئے ہیں اور کہیں کہیں ذاتی عناد کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی بدترین مثالیں بھی میں نے کلکتہ کے اردو اخباروں میں دیکھی تھیں۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر اردو صحافت کو زرد صحافت کہنا بڑی ناانصافی ہے اور

حقائق کے منافی ہے۔ زرد صحافت بے بنیاد خبروں، گمراہ کن مبالغوں اور غیر مہذب زبان کے استعمال کو کہتے ہیں۔اس وقت میں اس کی مثالیں دینا مناسب نہیں سمجھتا۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ایسی مفید اور قابل حوالہ کتاب کو مرتب کرنے پر ڈاکٹر امام اعظم صاحب کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ بقول غالبؔ ''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر'' میں ڈاکٹر امام اعظم صاحب سے امید کرتا ہوں کہ کلکتہ کے صحافیوں کے نقوش بھی اجاگر کریں گے کیونکہ اب تک تو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ کلکتہ میں صرف تین قابل ذکر صحافی پیدا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور احمد سعید ملیح آبادی۔ اور بس۔کلکتہ کی اردو صحافت سے ان کے علاوہ بھی ابراہیم ہوش، شین مظفر پوری، سید محمد مصطفیٰ صابری، رئیس الدین فریدی وغیرہ کے علاوہ بھی کئی شخصیات وابستہ رہ چکی ہیں۔مثلاً پروفیسر جاوید نہال، جن لوگوں نے اپنے لہو سے کلکتہ کی صحافت کی شمع روشن رکھی انھیں فراموش کر دینا بڑی ناسپاسی اور خود اس صحافت کی مجموعی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

◈◈◈

خواتین کی خودنوشت سوانح عمری

حقانی القاسمی کوئی درجن بھر تصنیفات اور بیشمار مضامین کی تخلیق کے علاوہ مجلّاتی صحافت کے دشت جنوں سے بھی گزرتے ہوئے اس راہ میں ''استعارہ''، ''بزمِ سہارا'' اور ''عالمی سہارا'' جیسے نشانات ثبت کرنے کے بعد کسی نئے خارزار کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ انھیں کانٹے بہت عزیز ہیں وہ کانٹوں کو ''زندگی کے تحرک کی علامت'' سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نئے خارزار کو ''اندازِ بیاں'' کا عنوان دیا ہے۔ وہ اسے ایک موضوعاتی مجلّہ کہتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ صرف ایک مجلّہ نہیں ایک مجلداتی سلسلہ ہے کیونکہ اس کو 'نمبر:ا' درج کیا ہے اور آئندہ موضوع کا اعلان بھی کیا ہے۔ اگلا عنوان ہے ''پولیس کا تخلیقی چہرہ''۔

فی الحال ہمارے پیش نظر اس سلسلے کا پہلا مجلّہ ہے جو خواتین کی خودنوشست سوانح عمریوں پر مشتمل نہیں بلکہ ان کے متعلق دوسرے لکھنے والوں کے ۲۴ مضامین کا مجموعہ ہے لیکن ان مضامین سے پہلے ایک تمہید طولانی ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ''آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے'' اس تمہید کے عنوان ''جنوں زاویہ'' کا مدعا عنقا ہی رہے گا تا آنکہ قاری ان بیس صفحات سے سلامتی کے ساتھ گزر نہ جائے۔ اس عنوان سے پہلے بھی کئی عنوانات ہیں۔ ''باغ شفقت'' اس کے تحت ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ دوسرا

عنوان ہے ''شجرِ محبت'' اس کے تحت بھی ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ تیسرا عنوان ہے ''شاخِ الفت'' اس کے تحت بھی ناموں کی ایک فہرست ہے۔ چوتھا عنوان ہے ''دریچے'' اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اس کتاب کے مشمولات کی فہرست ہے۔

حقانی کو اپنی اس کوشش نا تمام پر افسوس ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میری کوشش تھی کہ تمام زبانوں میں لکھی گئی خواتین کی آپ بیتیوں کے حوالے سے گفتگو ہوتا کہ نسائی دکھ اور احتجاج کے عالمی منظر نامے سے آگہی ہو سکے مگر کوششوں کی کامیابی کے لیے جن وسائل اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محرومی اکثر آرزوؤں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ سو ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔

اس اظہار افسوس کے باوجود حقانی نے اپنے ابتدائیہ میں اور دوسرے مضمون میں جس کا عنوان ہے ''جو رہی سو بے خبری رہی'' جو کہ دراصل ادا جعفری کی خودنوشت کا عنوان ہے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اس سے اس کتاب کے مشمولات کے بڑے حصے کا احاطہ ہو جاتا ہے اور نسوانی ذہن کے بہتیرے گوشوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

> ''خواتین کی آپ بیتیاں پڑھتے ہوئے بالکل ایک نئی دنیا روبرو ہوتی ہے جس میں حزن ہے، کسک ہے، درد ہے، دکھ ہے، تنہائی ہے، اداسی ہے، اضطراب ہے، افسردگی ہے، احتجاج ہے، مزاحمت ہے۔ امرتا پریتم کی ''رسیدی ٹکٹ'' آج بھی ذہن کو مشتعل کرتی ہے، ادا جعفری کی جو رہی سو بے خبری رہی، پدما سچدیوں کی ''بوند یاوڑی'' پڑھتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔ کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' پیاری لگتی ہے، سعیدہ احمد کی ''ڈگر سے ہٹ کر'' بھی اچھا تاثر پیدا کرتی ہے، ادا جعفری کی جو رہی سو بے خبری رہی آدھی دنیا کے درد سے باخبر کرتی ہے۔ اجیت کور کی ''خانہ بدوش''، کسم النسل کی ''جو کہا نہیں گیا'' اور کرشن اگنی ہوتری کی ''لگتا نہیں ہے دل مرا'' اور مینکا گپتا کی ''حادثے'' ایسی خودنوشتیں ہیں جن میں ان خواتین نے نسائی

تخلیقی اظہارات اور لمحات گزراں کے نئے تجربے پیش کیے ہیں۔ تسلیمہ نسرین اور تہمینہ درانی بھی اچھے مونتاژ تیار کرتی ہیں لیکن ان دونوں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ مشرقی معاشرے میں ان کی تحریریں مضر سمجھی جاتی ہیں۔''

''خواتین نے صرف نثر میں آپ بیتی نہیں لکھی ہے بلکہ منظوم خودنوشت سوانح عمری بھی عورتوں کے قلم سے وجود میں آئی ہیں۔ رشیدہ عیان (سیدہ رشیدہ بیگم مرادآبادی، حال مقیم امریکہ) نے ''میری کہانی'' کے عنوان سے ۲۷۸ صفحات پر محیط منظوم خودنوشت لکھی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں رشیدہ عیان نے بہت خوبصورت باتیں لکھی ہیں۔ 'دنیا میں کہی سنی بات یہی ہے کہ اپنی داستانِ حیات لکھنا آسان کام نہیں، انگاروں پر چلنے کے مترادف ہے، صداقت کے پتھروں پر جب زندگی کے قدم پڑتے ہیں تو پاؤں سے روح تک چھل کر زخمی ہوجاتے ہیں اور جب لہو بہتا ہے تو وہی لکیریں تحریر بن جاتی ہیں۔''

میرا خیال ہے کہ یہ خودنوشت مثنوی کی شکل میں ہوگی۔ اگر چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے گئے ہوتے تو زیادہ لطف آتا۔ یہی بات ابرار احمد اجروی کے مضمون بعنوان ''عربی زبان میں خودنوشت'' کے متعلق درست معلوم ہوتی ہے۔ چند حوالوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ عالم عرب میں جو تازہ ہوائیں چلی ہیں انھوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

پنجابی مصنفہ اجیت کور کی ''خانہ بدوش'' پڑھتے ہوئے مشہور رقاصہ اساڈورا ڈنکن Isadora Duncan یاد آگئیں جنھوں نے اپنی آپ بیتی My Life میں لکھا ہے کہ ''آج تک کسی عورت نے اپنی زندگی کی صداقت ظاہر نہیں کی۔ مشہور عورتوں کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ان کے ظاہری وجود کا حساب کتاب ملتا ہے......نشاط اور کرب کے عظیم لمحوں سے متعلق سب کی سب حیرت ناک طور پر خاموش ہیں۔'' اگر اساڈورا اجیت کور کی خودنوشت پڑھ لیتیں تو شاید انھیں اپنی بات میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی۔

حقانی نے ہندوستان میں مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی خواتین کی خود نوشتوں کا بھی اجمالی تذکرہ کیا ہے جیسے کہ سیاست میں، صحافت میں، طب اور زراعت کے پیشوں میں۔ انھوں نے نفیسہ بانو شمع کی خودنوشت ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' کا بھی تذکرہ کیا ہے جس میں جذبوں کے قبرستان کی ویرانی ہوبہو کرتی ہے۔ نفیسہ بانو شمع کی اس داستان میں جتنے نسائی کردار ہیں سب کشتۂ تیغ ستم ہیں۔

بڑی پرکشش اور دلچسپ ہے داستان حرم۔ جن خواتین کی خود نوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ زیرِ نظر کتاب میں آیا ہے وہ یقیناً کربناک اور اذیت ناک حالات سے گزری ہوں گی اور وہ اس کے اظہار پر قادر ہوں گی، ان کے انہی حالات نے انھیں اتنی مہلت بھی دی ہوگی کہ وہ اپنے احساسات کو ضبطِ تحریر میں لائیں لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ حقیقتیں ہیں۔ اول تو یہی جس کا تذکرہ حقانی نے اساڈورا ڈنکن Isadora Duncan کی خود نوشت My Life کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ''آج تک کسی عورت نے اپنی زندگی کی صداقت ظاہر نہیں کی۔ مشہور عورتوں کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ان کے ظاہری وجود کا حساب کتاب ملتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات اور واقعات جن سے ان کی حقیقی زندگی کی ایک جھلک بھی سامنے نہیں آتی۔ نشاط اور کرب کے عظیم لمحوں سے متعلق سب کی سب حیرت ناک طور پر خاموش ہیں۔''

دوسرے ساری اذیتوں کا ٹھیکرا مردسری نظام کے سر پر پھوڑنا صحیح نہیں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خواتین کو اپنی ساس اور نندوں کی زبان سے جو کچھ نکلے اس کو سننا اور ان کی طرف سے جو کچھ آئے اس کو جھیلنا پڑتا ہے وہ کم وبیش سب پر عیاں ہے۔ مزید یہ کہ انسانی معاشرے نے اپنے آغاز سے اب تک تہذیبی ترقیوں کے دور سے گزرتے ہوئے اور اس کے اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے دعوؤں کے باوجود ایسا کوئی نظام مرتب اور مروج نہیں کیا جہاں سارے انسانی طبقات کے درمیان مکمل مساوات اور انصاف ہو۔ اس نا

انصافی کا شکار بلا امتیاز مرد و زن سب ہوتے ہیں شاید عورتوں کے حصے میں زیادہ ناانصافیاں آتی ہیں۔ آخر دونوں اصناف کی بشری کمزوریوں اور توانائیوں کے درمیان جو فرق اور فاصلہ ہے اس کا کیا کیا جائے۔

تیسرے یہ کہنا کہ زندگی کا سارا عذاب صرف عورتوں کے حصے میں آتا ہے، مرد اس سے بالکل مبرا ہیں انصاف سے بعید ہوگا۔ عذاب کی نوعیتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مغربی ایشیا اور افریقہ کے کتنے ہی ملکوں میں مرد کنوارے رہ جاتے ہیں کیونکہ لڑکی والوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے بھاری رقوم کا وہ انتظام نہیں کر پاتے۔ ان لوگوں کا عذاب کس نے دیکھا سنا اور لکھا ہے۔ خود ہمارے یہاں روزے رکھ کر دن دن بھر محنت مشقت کرنے والوں کی مزاج پرسی کس نے کی ہے۔ سرد راتوں میں کھیتوں میں آب پاشی کرنے والے کاشتکاروں کا حال خراب کس نے دیکھا ہے۔ فصلوں کی خرابی اور سرکاری اور غیر سرکاری قرضوں کی عدم ادائیگی اور تقاضوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والے کسانوں کے درد کو کس نے بانٹا ہے، ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ سالانہ بتائی جاتی ہے۔ آج کا کسان ایک بھی ''خوشۂ گندم'' کو نہیں جلاتا، خود زہر کھا کر سو جاتا ہے۔

وہ جو مرنے پر تلا ہے اخترؔ
اس نے جی کر بھی تو دیکھا ہوگا

(وکیل اخترؔ، کلکتہ)

اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں بہتیرے معاشرتی نظاموں کا رواج رہا ہے اور نئے نئے تجربات بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں کثرت ازدواج کی بھی مثالیں ہیں تو کثرتِ شوہری کی بھی، پدرسری اور مادرسری بھی، ان سب سے گزرتے ہوئے ہم جمہوریت کے سرسری نظام تک پہنچے جہاں بلاتفریق مرد و زن سروں کی گنتی ہوتی ہے لیکن اس میں بھی ایک خاتون کی آمرانہ خودسری کو بھی دیکھا گیا جس کو ایمرجنسی

کا نام دیا گیا۔ ہمارے یہاں سلطانہ اور مہارانیاں حکمراں ہوئیں، سربراہِ مملکت اور سربراہانِ حکومت خواتین ہوئیں لیکن اصل سوال جہاں کا تہاں ہے انھوں نے خواتین کے ساتھ منصفانہ سلوک اور ان کے حالات میں بہتری کے لیے کیا کیا۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ مسئلہ کی جڑ کہیں اور ہے۔ شاید وہ مسئلہ دونوں صنفوں کے درمیان بشری کمزوریوں اور توانائیوں کے فرق کا ہے اور نزلہ برعضوضعیف تو ہوتا ہی ہے۔

ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع ایسا سمندر ہے کہ اس کوزے میں نہیں سما سکتا لیکن اردو کے علاوہ کئی دیگر زبانوں میں بھی خواتین کی سرگزشتوں کی چاشنی تو مل ہی جاتی ہے۔ یوں یہ موضوع ایسا ہے کہ اس سے کبھی سیری نہیں ہوسکتی بلکہ تشنگی بڑھتی ہی جائے گی۔ خواتین کی خودنوشت پر مختلف زاویوں سے روشنی کی بات یوں ہے کہ مضمون نگاروں نے مختلف خود نوشتوں کو جیسا دیکھا یا سمجھا اسی کے مطابق ان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں کہیں اقتباسات میں لکھنے والی خواتین کی فکری کاوشوں کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

تمہید کے بعد پہلا مضمون رحمت یونس کا بعنوان ''خودنوشت کا فن'' ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے اردو میں ۳۷ خودنوشتوں کی ایک فہرست ہے۔ آگے چل کر صبیحہ انور کی تصنیف ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' کے مبسوط اقتباسات ہیں جن میں کئی انسائیکلو پیڈیا اور چند مستند لکھنے والوں کے حوالے سے خودنوشت سوانح نگاری کے خواص اور ان کے عمومی مواد کا ذکر ہے۔ جن میں ایک بات تقریباً مشترک ہے وہ یہ کہ یہ تحریریں عموماً عمر کے آخری حصے میں لکھی جاتی ہیں اور وہ لوگ لکھتے ہیں جو اظہارِ ذات کے متمنی ہوتے ہیں ایسے میں امید تو یہی کی جاتی ہے کہ لکھنے والا اپنی ذات کے متعلق سب کچھ بے لاگ لپیٹ لکھ گیا ہوگا لیکن میرے خیال سے یہ ضروری نہیں ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ لکھنے والے نے اپنی زندگی کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہوگا۔

ان حوالوں میں خودنوشت سوانح عمری کی جو تعریفات اور ان کے لکھنے کے جو

محرکات واسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس امر کی بھی صراحت ہوجاتی ہے کہ خودنوشت سوانح نگاری اعلیٰ درجے کی صنف ادب ہے۔ اس میں لکھنے والے کا اپنا اسلوب اور اندازِ تحریر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خودنوشتوں کے علاوہ بھی ہر شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں اس کی ذات کے اجزاء ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شعراء اور ادباء کی تصنیفات کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ شعر یا تحریر کس کی ہوسکتی ہے۔

اکرم پرویز کا مضمون ''شورش دوراں: نسائی جمال کا نفسی انفجار و انفصام'' دیکھ کر بازخوانی کا لطف آیا۔ دراصل حمیدہ سالم کی یہ آپ بیتی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور اتفاق سے تبصرے کے لیے میرے پاس آئی۔ میرا تبصرہ اخبارِ مشرق، دہلی میں جون ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ تحریر یا تصنیف شعری ہو یا نثری اس پر تبصرہ کرنے والے کا اپنا زاویہ نگاہ اور اسلوب نگارش بھی اس کی تحریر میں شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ اکرم پرویز کے مضمون کا عنوان ہی پڑھنے والے کو چشمہ صاف کر کے کمر کس لینے کا انتباہ کردیتا ہے۔ دراصل تحقیقی مضامین لکھنے والوں کی ایک زبان ہوتی ہے جو ان کے ہم زبانوں کے لیے ہوتی ہے نہ کہ عوام اور ہما شما کے لیے۔ بہرحال حمیدہ سالم کی زبان و بیان نہایت سادہ ہے وہ قاری کو اپنے زمانے اور اپنے دور کے سارے مناظر کی سیر کراتی ہوئی بڑھتی جاتی ہیں اور جن منزلوں اور مرحلوں سے گزرتی ہیں ان کے نشیب وفراز بھی جھلکاتی جاتی ہیں۔ مگر نہ کہیں شکوے شکایت ہیں نہ آہ و بکا۔ ایک مردسری اور روایتی سماج میں رہتے ہوئے لمبی چھلانگوں سے ہفت خواں پار کرتی جاتی ہیں۔ ان کی ان کامیابیوں اور کامرانیوں میں حمید سالم کی جسارتوں کے علاوہ ان کے کنبے کے لوگوں کی وسعت نظر کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت کے ذریعہ دراصل یہ واضح پیغام دیا ہے کہ ''انہی پابندیوں میں رہ کے حاصل آزادی کو تو کرلے۔''

مزید یہ کہ بہت بڑی اکثریت ایسی خواتین کی ہے جو کامیاب و کامران، خوش اور خوشحال ہیں۔ شاید انھیں ایسی کسک اور ایسی جراحت کا احساس نہیں ہوا کہ وہ اس کا تحریری

اظہار ضروری سمجھیں۔ ایسی خواتین بھی ہیں جن کی جراحت سے مرد تنگ ہیں۔ کانپور میں ہمارے ایک پڑوسی ایک دن دامن میں پھٹے ہوئے نوٹ سمیٹے گڑگڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپیہ ماں کو دے دیا تھا پھر بقیہ بیوی کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے آج شکم مادر میں بچیوں کو زندگی کے حق سے بھی محروم کرنے کی وبا چل پڑی ہے، اس کی ذمہ دار شاید باپ سے زیادہ ماں ہے۔

بہرحال اب Live-in relationship کو قانون اور سماج تسلیم کرتا جارہا ہے ایسے میں مردسری نظام سے نجات کی طالب خواتین کے لیے میدان بڑا وسیع ہے لیکن ایک زمانہ گزر جانے کے بعد سماج کا حلیہ کتنا مسخ ہو چکے گا اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت لکھی جانے والی سوانح عمریاں خواہ کسی کی ہوں شاید مختلف ہوں گی۔

حقانی صاحب نے حکایات و شکایات حرم کی جو داستانیں پیش کی ہیں وہ دلچسپ ہیں اور انھیں 'سینۂ گل کے گداز (دروں) تک پہنچنے کی' سعیِ ناتمام پر کسی قدر اطمینان ہو جانا چاہیے۔

◈◈◈

اسپَین میگزین

سفارت خانے اپنے ملک اور میزبان ملک کے درمیان تعلقات کے استحکام اور فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے وہ میزبان ملک میں ہر سطح پر رابطے قائم کرتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کئی عشروں تک مطبوعات ہی ان رابطوں کا بہترین ذریعہ تھے چنانچہ مختلف سفارتخانے خبرنامے اور جرائد جاری کرنے لگے ان کے ذریعہ اخباروں، عوامی نمائندوں اور براہِ راست عوام کے مختلف مکاتب فکر اور ان کے اداروں تک رسائی ممکن تھی۔ چنانچہ دہلی میں کئی سفارتخانوں نے اپنے دفتر اطلاعات قائم کیے اور خبرنامے جاری کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہی دفاتر جرائد اور رسالے بھی شائع کرنے لگے۔

انہی میں سے ایک دہلی میں امریکی سفارت خانے کے دفتر اطلاعات سے شائع ہونے والا جریدہ اسپَین ہے جو اپنے ظاہری اور باطنی خواص اور خوبیوں کی بنا پر لاثانی ہے۔اس کی عمر ہماری آزادی کی عمر سے محض بارہ تیرہ سال کم ہے۔ انگریزی میں اس کی اشاعت ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی لیکن جب اس کی عمر چالیس کی پختگی سے آگے بڑھی تو ہندوستانی زبانوں میں اس کی اشاعت بھی ضروری خیال کی گئی چنانچہ نئی صدی میں اس کی اشاعت اردو اور ہندی میں بھی شروع کی گئی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی ہورہی ہے کہ

میں اپنی بہت چھوٹی سی حیثیت میں بھی کسی نہ کسی طور اس رسالے سے وابستہ رہا ہوں۔

یوں تو اس رسالے کی ظاہری خوبیاں اس کو بے مثال بنانے کے لیے کافی ہیں مثلاً کسی سفارت خانے نے آج تک نہ ایسا آب وتاب والا اور کثیر الجہات رسالہ شائع کیا ہے نہ اتنے عرصے تک مسلسل شائع کیا ہے۔ اس کا گٹ اپ اور ٹائٹیل، کاغذ، پرنٹنگ سب لا جواب ہوتا ہے۔ اس کے مضامین کا تنوع زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتا ہے۔ ادب، سیاست، صحافت، سائنس، ٹیکنالوجی، طب، تعلیم، خلا، فلکیات، ارضیات، پیشے، تفریحات، سیاحت وغیرہ اس وجہ سے اسپین پر کسی سفارت خانے کے پبلسٹی کی غرض سے شائع ہونے والے رسالے کا تو گمان ہی نہیں ہوتا۔ مضامین اور موضوعات کے اس تنوع کی وجہ سے یہ ہمیشہ توانا اور وقت کے ساتھ ساتھ ہم کاب نظر آتا ہے۔ ہمیشہ غلطیوں سے پاک ہونا اس کی ایک غیر معمولی صفت ہے۔ مطبوعات کے جائزے لینے والے ادارے اسپین کو ہر سال بہترین رسالے کا ایوارڈ دیتے ہیں۔

با ایں ہمہ اردو میں اسپین کی اشاعت معجزات کے مرکب کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ ساری عبارت اور تصویروں کو ریورس یعنی بائیں سے دائیں کرنا کیا کسی معجزاتی فنکاری سے کم ہے۔ گزشتہ تین چار عشروں کے دوران پرنٹنگ ٹیکنالوجی کے انقلابات نے یقیناً اس کام کو آسان بنادیا تاہم آرٹسٹ کی چابک دستی کی اہمیت کم نہیں ہے۔

اشاعت کے اس مرحلے سے پہلے اگر انگریزی مواد کے اردو میں ترجمہ کی بات کروں تو کہوں گا کہ اسپین کے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کچھ آسان نہیں تھا۔ میں نے ۲۰۰۳ء میں اردو اسپین کی اشاعت کی ابتداء سے ہی کئی سال تک اس کے لیے مضامین کے ترجمے کیے جن کی تعداد ۲۷ ہے، اس میں بڑی محنت کی ضرورت ہوئی، اس کی کئی وجوہ ہیں اول تو یہی کہ انگریزی ایک عالم گیر زبان ہے ہر ملک میں ہی نہیں بلکہ ہر ملک کے مختلف علاقوں میں بھی زبان کا لب ولہجہ اس کے محاورے اور اظہارِ خیال کے طریقے مختلف ہوا

کرتے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ مختلف علاقے ہسپانوی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں سے کافی متاثر ہیں اس لیے ان علاقوں کے لکھنے والوں کی تحریروں میں ان مختلف زبانوں کے اثرات ہوا کرتے ہیں۔ مزید براں مضامین کا تنوع مشکلوں کا سبب بنتا ہے۔ ہر فن مثلاً میڈیکل یا ٹیکنالوجی کے مختلف شعبے خصوصاً خلائی ٹیکنالوجی کی بیشمار الگ الگ اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ بھی مسلسل تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ ان کے ترجمے میں اکثر ایجاد معانی سے کام لینا ہوتا ہے۔ مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ شکاگو سے ایک صاحب نے فن تعمیر پر ایک مضمون اسپین کے لیے انگریزی میں بھیجا۔ غالباً وہ اصلاً حیدرآباد کے رہنے والے تھے، انھوں نے ہدایت کی کہ اردو اسپین میں اشاعت سے پہلے اس کا ترجمہ ان کے دیکھنے کے لیے بھیجا جائے۔ چنانچہ میں نے اس مضمون کا ترجمہ کیا اور اس کو ان کے پاس بھیجا گیا۔ شکر ہے وہ ان کی منظوری سے سرفراز ہوا۔

شروع سے ہی اسپین سے میری وابستگی کی کہانی بھی تقریباً ناقابل یقین ہے۔ جب اسپین میگزین کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ سینئر ایڈیٹروں اور قانون ساز ممبروں وغیرہ کو مفت بھیجا جاتا تھا لیکن اس پرچے کی لاگت بہت زیادہ تھی، اس لیے اس کی گرانی جلد ہی محسوس کی جانے لگی لیکن اس کو بند کرنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید ضروری فنڈ کی عدم دستیابی کی وجہ سے دوبارہ اس کی اشاعت شروع کرنا ممکن نہ ہو سکے۔ میں اس وقت USIS (موجودہ امریکن سینٹر) کلکتہ میں جز وقتی اردو مترجم کے طور پر کام کر رہا تھا اس لیے جو امور موضوع گفتگو ہوتے ان کی خبر رہتی ہی تھی چنانچہ ایک روز میں نے اپنے پریس آفیسر سے کہا کہ صاحب کیوں نہ پرچے کی کوئی قیمت معین کردی جائے۔ وہ خاموش رہے لیکن وہ بات اوپر تک ضرور گئی اس لیے کہ کچھ ہی دنوں بعد ماہنامہ اسپین (اب دو ماہی ہے) کی قیمت پانچ روپیہ طے پائی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس کی مناسب تقسیم کا سوال بھی پیدا ہوا۔ کتاب کی بڑی دوکانوں کے علاوہ اخباری اسٹالوں پر بھی رکھنا طے پایا۔ اس کے

بعد مزے کی بات یہ ہوئی کہ کلکتہ میں دس نمایاں مقامات پر نیوز پیپر اسٹالوں کو تلاش کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا چنانچہ میں نے ان کی نشاندہی کر کے ان کے پتے اپنے پریس آفیسر مسٹر سی ایم راس کو دے دیے۔ اگلے دن وہ میرے ساتھ دو تین اسٹالوں پر گئے اور ان سے ضروری گفتگو کے بعد بقیہ کام مکمل کرنے کے لیے پریس چیف مسٹر گنگولی کو مامور کیا۔

ہر فرد، ادارے اور اخبارات کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں چنانچہ ان مرحلوں سے اسپین کو بھی گزرنا پڑا۔ سرکولیشن بڑھانے اور قیمت میں اضافے وغیرہ کے مرحلے بھی آئے لیکن میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں دو مختلف موقعوں پر میں نے اسی سادگی کے ساتھ دو مشوروں کی کارفرمائی دیکھی خواہ اس کا کریڈٹ کسی کے حصے میں گیا ہو۔ ایک تو یہ کہ اسپین کے سارے مضامین امریکیوں کے لکھے ہوئے ہوا کرتے تھے میں نے کہا کہ کبھی ہندوستانیوں سے بھی لکھوایئے تاکہ اس سے یہاں کے قاری کی دلچسپی بڑھے، چنانچہ کچھ ہی دنوں میں یہ سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ابتدائی لکھنے والوں میں مجھے بمبئ کے ایک ایڈوکیٹ اے جی نورانی کا نام یاد پڑتا ہے۔ دوسرا مشورہ جو میں نے برسرِ عمل دیکھا وہ یہ تھا کہ امریکہ میں ہندوستانیوں نے جو کارنامے انجام دیے ہوں ان کے تذکرے بھی کبھی کبھی شامل کیے جائیں۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نوع کے مضامین بھی شریکِ اشاعت ہونے لگے۔

اب اس مجموعہ کمالات بلکہ مجموعہ کرامات کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اپنی یادوں کو ضابطۂ تحریر میں لاؤں، شکر ہے اپنی طبعی اور فطری کمزوریوں کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھ ڈالا۔

◈◈◈

حجاب اسلامی

ماہنامہ حجاب اسلامی کا ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم خصوصی نمبر پیش نظر ہے۔ کسی سنجیدہ اردو ماہنامہ کا پندرہ سال تک پابندی سے نکلتے رہنا اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز واقعہ یا وقوعہ ہے۔ دوسری حیرت انگیز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دواخانوں کے علاوہ دیگر اشتہارات بھی ہیں۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، یہ جریدہ خواتین کے لیے مختص ہے، لیکن عنوان کے اوپر تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو طالبات بھی پڑھ سکتی ہیں۔ آخران کو تو خواتین ہی ہونا ہے۔

مشمولات میں سارے مضامین حسبِ ذیل خاص عنوانات کے تحت ہیں گویا ان کو ایک ایک باب تصور کرنا چاہیے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں: مسلم عورت کا گھریلو کردار، مسلم خاتون کا سماجی کردار، سماجی خدمت کی چند جہات، تین خاص میدان، مسلم خاتون کا دعوتی اور اصلاحی کردار، مسلم خاتون کا سیاسی کردار، مسلم خاتون کا معاشی کردار، غرض یہ کہ مسلم خواتین کی زندگی اور اس کے تلازمات کے تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔

سماجی خدمت کی چند جہات کے تحت ایک مضمون بعنوان ''سوشل میڈیا، سماجی تبدیلی اور خواتین'' ایک اہم موضوع ہے اس لیے کہ نئی صدی میں سوشل میڈیا نام کی ایک ''نمو'' وجود میں آئی ہے اور آندھی کے غبار کی طرح معاشرے کے ہر پہلو پر پوری طرح محیط

ہوگئی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس میں سوشل کے نام پر بہت کچھ اَن سوشل بھی گھل مل گیا ہے، اس کدورت سے اچھی طرح آگاہ ہونا اور اپنے بچوں کو آگاہ کرنا بہت ضروری ہے اور یہ بارِ گراں سب سے زیادہ ماؤں کے حصے میں آتا ہے۔ اس لیے خود ان کا باشعور اور سمجھدار ہونا ضروری ہے۔ اگلی نسلوں کی رہنمائی کے لیے یہ باتیں تو ہمیشہ ہی ضروری رہی ہیں لیکن ہمارے روایتی معاشرے میں ماؤں کی جو عموماً خاتون خانہ ہوا کرتی تھیں اتنی خوبی کافی ہوا کرتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دین سے اپنی زبان سے اور معاشرتی آداب سے اچھی طرح شناسا کردیں۔ اگلے مرحلے کی ذمہ داری عموماً باپ پر ہوتی تھی یعنی اس کی تعلیم کی کہ وہ کیسی ہو، حسب حیثیت کس درجہ تک ہو وغیرہ وغیرہ لیکن آج تعلیم کے میدان میں اتنی جہتیں ہوگئی ہیں اور تعلیم اتنی مہنگی ہوگئی ہے کہ عام آدمی کے لیے حسب خواہ اپنے بچوں کو کسی راہ پر لگانا مشکل ہوتا جارہا ہے، اور سب کچھ حسب خواہ اور حسب توفیق کرنے کے باوجود کسی حسب خواہ مستقبل کا ہونا غیر یقینی ہے۔

جس ''نمو'' کو سوشل میڈیا کہتے ہیں وہ اس اعتبار سے تو عوام کے لیے واقعی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ آج بکاؤ میڈیا اور بکاؤ چینلوں نے جس طرح عوام کی سوچ پر شب خوں مارا ہے اس کے لیے سوشل میڈیا ایک موثر کاٹ ہے۔ اس نے عوام کو ایک نیا حربہ، اپنی آواز بلند کرنے کا ایک نیا آلہ فراہم کیا ہے لیکن اس کے غلط اور گمراہ کن استعمال کے اثرات سے اپنے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے والدین میں بالخصوص ماؤں میں عصری آگہی کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے ان میں مذکورہ بالا خوبیوں کے ساتھ ساتھ نئے شعور اور بچوں کی تربیت کے نئے آداب اور اصولوں کو سمجھنا اور برتنا ضروری ہوگیا ہے۔ محولہ بالا مضمون اس لحاظ سے بہت معلومات افزا اور وقیع ہے کہ سوشل میڈیا سے متعلق بہت سارے اعداد وشمار اکٹھا کر کے پیش کیے گئے ہیں لیکن دراصل خواتین کو کیا کرنا چاہیے یہ بات بہت کم بتائی گئی ہے۔ مناسب ہوگا کہ حجاب اسلامی کی اشاعتوں میں اس طرح کے مضامین بالاستیعاب شائع کیے

جائیں جن میں انھیں نئی گمراہیوں کے سامان سے آگاہ کیا جائے اور اپنے بچوں کو ان کے اثرات بد سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں بتائی جائیں۔ معصوم بچے تو سوشل میڈیا کے پیش کردہ مواد کو صرف ایک دلچسپ چیز سمجھتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ سرایت کرنے والے اس زہر کی ہلاکت خیزی سے نا آشنا ہوتے ہیں، نوجوانوں کو اس بلائے بے درماں کے قبیح اثرات سے محفوظ بنانا اور بھی مشکل ہے تاہم معاشرتی اصلاحات کی کلید کہی جانے والی مطبوعات کو یہ کام ایک راہ عمل کے طور پر اختیار کرنا ہوگا۔

ہمارے سماج میں اب بھی بچوں کی پرورش اور تربیت کا کام ماؤں کے ذمہ ہے اس لیے لازم ہے کہ وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ ان کے بچے کون سے ویڈیو، چینل، یا ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں اگر وہ دیکھیں کہ ان کے بچے کسی مخرب اخلاق یا خلافِ عقائد مواد کو پسند کرتے ہیں تو انھیں بہتر پروگراموں کی طرف متوجہ کرکے مخرب پروگراموں سے باز رکھا جائے۔ یہ کام بڑی ہوشیاری کا طالب ہے، کسی طرح کی سختی کرنے سے بچے ان پروگراموں کو دیکھنے کی دوسری تدبیریں اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے مائیں سارے پروگراموں کو مانیٹر نہیں کرسکتیں، ایسے میں حجاب اسلامی اور اس طرح کی دیگر مفید مطبوعات کی کوشش ہونی چاہیے کہ الیکٹرانک میڈیا کے مفید اور مضر مواد سے ممکنہ حد تک آگاہی فراہم کرتے رہیں اور بہت سارے مفید اور عمدہ چینلوں کو بھی اس ضرورت سے آگاہ کرتے رہیں تاکہ وہ انھیں اپنے پروگراموں میں شامل کرسکیں۔

ہمارے ملک میں تقریباً ستر فیصدی آبادی اب بھی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور وہاں رہنے والوں کی اکثریت زراعت پیشہ ہے یا گھریلو صنعتوں میں روزی روٹی کماتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے کہ اس علاقے کی پوری معاشی یا اقتصادی کارروائی میں عورت کا حصہ تقریباً نصف ہوا کرتا ہے۔ اب زراعت میں مشینوں کا عمل دخل بڑھتا جارہا ہے اس وجہ سے اس میدان میں عورتوں کی حصہ داری کم ہوتی جارہی

ہے لیکن اس کے باوجود کھیت کھلیان کی پیداوار گھروں میں پہنچ جانے کے بعد ساری عمل آوری عورت کے حصے میں آتی ہے۔ گھریلو صنعتوں میں شاید پارچہ بافی یعنی بنکری کی صنعت سب سے بڑی ہے اس میں گھر کی عورتوں کا حصہ بدرجہ اتم رہا ہے اور اب وہاں بھی مشینی عمل کے باوجود اس کی حصہ داری میں شاید زیادہ فرق نہ آیا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج شہروں میں بالخصوص تعلیم یافتہ خواتین کا مجموعی معاشی عمل میں شریک ہونا جو ایک مجبوری بنتا جارہا ہے وہ معاملہ صرف پس منظر اور کمائی کی نوعیت بدل جانے کا ہے ورنہ کمائی میں عورت کی حصہ داری ہمیشہ سے رہی ہے۔

ایک اور بڑے اہم پہلو کی طرف عموماً نظر نہیں جاتی وہ یہ ہے کہ کسی گھر کے مجموعی معاشی عمل میں صرف آمدنی کا شمار کیا جاتا ہے، بچت اور کفایت کے ذریعہ آمدنی میں جو اضافہ ہوتا ہے اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔ خواتین گھر کے بہتیرے اخراجات میں اصراف سے گریز کر کے کم کمائی سے زیادہ کام لے سکتی ہیں۔ اب تو تعلیم اور علاج معالجہ صرف یہی دو امور کسی عام آدمی کی اوسط کمائی کا بڑا حصہ چوس لینے کے لیے کافی ہیں، ایسے میں تعلیم یافتہ خواتین بچوں کی پڑھائی اور ٹیوشن پر خرچ ہونے والی مد میں بچت کر سکتی ہیں، اسی طرح سارے امور خانہ داری خصوصاً بچوں کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھ کر ان کی صحت مند کیفیت قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں اسی طرح عہد حاضر کے بے رحم طبی نظام کی ضرب کو کچھ ہلکا کر سکتی ہیں۔ یہاں ایک بار پھر اپنی بات دہرانا چاہتا ہوں کہ اس باب میں حجاب اسلامی جیسے اور دیگر سنجیدہ رسالے خاص رہنمائی کر سکتے ہیں اور انھیں ایسا کرنا اپنا اخلاقی فرض تصور کرنا چاہیے۔

حجاب اسلامی کے زیر نظر شمارے میں خواتین کے معاشی کردار سے متعلق بڑے اچھے، معلومات افزا اور چشم کشا مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ بہت سارے اعداد و شمار کے ذریعہ سوشل میڈیا کی بڑھتی ہوئی گرفت و گیرائی کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، لیکن وہ آخری

بات یعنی آمدنی پر بچت کے اثر پر گفتگو کم کی گئی ہے اس پر مسلسل اصرار کی ضرورت ہے۔

جہاں تک سارے الیکٹرانک میڈیا، تفریحات و اطلاعات کے سارے آلات کی ہمہ گیری کا تعلق ہے اس بارے میں بھی خواتین کی ذمہ داری پر مسلسل اصرار کی ضرورت ہے تاکہ وہ ان الیکٹرانک آلات سے بچوں کے زیادہ شغف کی وجہ سے ان کی ذہنی صحت خصوصاً بینائی کو پہنچنے والے نقصانات سے انھیں بچا سکیں۔ اکثر خواتین خود کو دیگر مصروفیات کے لیے آزاد رکھنے کی غرض سے بچوں کو ٹی وی کی طرف لگا کر اطمینان کر لیتی ہیں۔ یہ تغافل انتہائی مہلک ہے۔ یہ انتباہ کرتے رہنا ضروری ہے۔

میں ایک اور خاص بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ہمارے اسکولوں میں برسرکار معلّمات کا معاملہ۔ ان کی کیفیت، حالات کار وغیرہ کی طرف کبھی سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی گئی۔ ان سے کتنا کام لیا جاتا ہے، کتنا مشاہرہ دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ خواتین ہیں جو بلاشبہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے اکثر مجبوراً گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دن میں کام اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جو ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ اضافی ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی تفریحاً یہ کام اختیار کرتی ہوں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں بھی معیار سے بہت کم ہوتی ہیں اور کام کا بار اتنا ہوتا ہے کہ انھیں اسکول کا زائد کام گھر لے جا کر کرنا ہوتا ہے، جس کی کوئی زائد اجرت نہیں ملتی۔ یہ سب نہایت غیر منصفانہ اور غیر اخلاقی ہے، اس پر معاشرے کے بااثر لوگوں کو توجہ ضرور دینی چاہیے۔ ہمارے سنجیدہ رسالوں میں اور دیگر اخبارات میں بھی اس پر مضامین لکھنے چاہئیں خصوصاً اس وجہ سے کہ اب تعلیم گاہیں اچھا خاصا نفع بخش کاروبار ہو گئی ہیں تو اس صنعت میں کارگزاروں کو شریک کرنا بھی فرض ہونا چاہیے۔

ایک اور بات، گلوبلائزیشن کے طفیل عملاً دن رات کی تفریق ختم ہوتی جا رہی ہے چنانچہ بہت سے دفاتر میں ۲۴ گھنٹے کام ہوتا ہے۔ کارکنوں میں خواتین بھی ہوتی ہیں۔ ایسی

صورت حال میں ہماری خواتین کا مسئلہ خاص طور سے توجہ طلب ہے جو حج کے لیے بھی محرم کے ساتھ جانے کی پابند ہیں، مشکل یہ ہے بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی حالات میں ہماری خواتین ایڈجسٹمنٹ کس طرح کریں۔اس میں ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

◈◈◈

فیملی کونسلنگ

حجاب اسلامی کا خصوصی شمارہ

ماہنامہ حجاب اسلامی کے اس خصوصی نمبر کے موضوع اور مشمولات میں بڑی ندرت ہے۔ یہ ہمارے بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں خاندانوں اور افراد خاندان کی ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ معاشرے میں لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی مسائل ہمیشہ درپیش ہوتے ہیں۔ان میں الجھنیں اور پیچیدگیاں بھی ہوتی ہیں،جنھیں سلجھانے کی کوششوں میں کامیابیاں اور ناکامیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں یہ چیزیں بھی وقت اورضرورت کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارا روایتی سماج جوکئی اعتبار سے بستہ اور پیوستہ ہوا کرتا تھا ہمارے دیکھتے دیکھتے یکسر موہوم ہوگیا، وہ ایک طرح کی شہریت میں بدلتا جارہا ہے۔

اس روایتی سماج کا خاصہ یہ تھا کہ خاندان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی یعنی خاندان ہی معاشرے کی بنیادی اینٹ تھا۔اس میں چھوٹے بڑے سب ایک اَن کہے ضابطے کے پابند تھے۔خاندان کے بزرگ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی تھی۔اس کا احترام سب پر واجب تھا اورخوداس بزرگ پرسب کی سرپرستی اورسب کی بہی خواہی لازم تھی۔خاندان کے اندر ذمہ داریوں کی ایک اَن کہی تقسیم تھی لیکن حالات کے تغیرات نے اس ڈھانچے کے

تار و پود بکھیر دیے۔ معاشی اور اقتصادی ضرورتوں اور ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ضروری تگ و دو نے لوگوں کو گاؤں سے قصبات اور شہروں کی طرف اور وہاں سے بڑے شہروں کی طرف بلکہ بیرون ملک تک ہجرتوں پر مجبور کر دیا۔ ان ہجرتوں کے نتیجے میں بزرگ پیچھے رہ گئے اور بے سہارا بھی ہو گئے۔ نئی نسلوں کو نہ ان بزرگوں کی ضرورت رہ گئی اور نہ ان سے کوئی لگاؤ رہ گیا۔ لیکن معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل نے تو لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان میں کوئی کمی آنے کے بجائے وہ بڑھتے ہی گئے۔ ان کی پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ ان کی گتھیاں الجھتی گئیں۔

ظاہر ہے ہر مسئلہ حل کا طالب ہوتا ہے اور اسے حل کرنے والوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ روایتی سماج میں اس مرض کا معالج بھی اسی جگہ موجود ہوتا تھا، یعنی خاندان کا بزرگ اور سرپرست۔ نئے معاشرتی حالات میں جہاں ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بیشمار چیزیں ایجاد کی گئیں، نئے پرانے امراض کے لیے نئی نئی دوائیں اور حکمتیں دریافت کی گئیں، اسی طرح معاشرتی امراض کے لیے علاج معالجے بھی دریافت کیے گئے۔ وہ ہیں ماہرین نفسیات، تحلیل نفسی کے ماہرین، اس طرح کے افراد اور ادارے۔ اس نئی طرح کی مشاورت کو نصیحت اور ہدایت کے بجائے کونسلنگ یا کنسلٹیشن کا نام دیا گیا۔ موجودہ دور اسپیشلائزیشن یا تخصیصیت کا بھی ہے۔ چنانچہ معاشرتی امراض کے معالجوں نے بھی اپنے فن میں تخصیصیت کو راہ دی۔ لیکن یہ طریقہ علاج مریض اور معالج دونوں سے بڑے صبر و استقلال کا تقاضہ کرتا ہے۔ یوں دیگر علاج معالجوں میں بھی ہم اسی طوالت اور تردد کا مشاہدہ کر رہے ہیں جو معالج سے مریض کے روبرو ہونے کے بعد طرح طرح کے ٹیسٹ اور دوائیوں کے استعمال اور ان کے مفید اور منفی اثرات اور کیفیات مابعد کی ضرورت میں نظر آتے ہیں۔ بہرحال معاشرتی علائق کے اس جنجال سے نجات کی اس نئی راہ سے لوگ بالعموم واقف نہیں ہیں۔ ہسپتالوں کی راہداری سے گزرتے ہوئے کچھ لوگ وہاں تک پہنچتے ہیں، معلوم نہیں اس علاج کے ذریعہ

شفایاب ہونے والوں کی شرح کیا ہے۔

ان دنیاوی کارروائیوں اوران کے اثرات سے قطع نظر اگر ہم اپنے دین کی طرف رجوع کریں تو ہمیں ان معاشرتی امراض کا خواہ وہ انفرادی ہوں، باہمی ہوں یا اجتماعی سب کا علاج موجود ملتا ہے جو روایتی اور نئے معاشروں میں یکساں قابل عمل ہے اور اس کی اثر آفرینی کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ مصالحت اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت قرآن حکیم میں بھی موجود ہے اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ان کی روشنی میں معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں علمائے کرام اور مفتیان عظام سے رجوع کرکے ان کی رہنمائی میں ضروری اقدامات کرنا افضل ہے اور آسان بھی۔ اپنے معاملات کو عدالتوں میں لے جانا زندگی بھر کی مصیبت مول لینے اور زندگی برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے بہتر تو کونسلنگ کی راہ ہے۔ اس کا انجام جو بھی ہو لیکن قانونی الجھنوں میں پڑ کر زندگی کو جہنم بنانے سے تو بہتر ہے۔

حجاب اسلامی کے زیر تبصرہ شمارہ میں کونسلنگ کے طور طریقے اور اس کی افادیت کو اچھی طرح سمجھانے کی کئی مضامین میں کوشش کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ کئی مضامین میں خاندانی مسائل اور انھیں حل کرنے کے طور طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی راہ عمل کی وضاحت کرنے والے مضامین بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو اس شمارے کو بیحد مفید کہا جا سکتا ہے۔ قاری کو درپیش مسائل کو حل کرنے میں اس کی رہنمائی خود جریدے کی افادیت اور اس کی مقبولیت میں اضافے کا موجب ہوتی ہے۔

دراصل قارئین اور ناظرین کی رہنمائی صحافت کے اولین فرائض میں سے ہے۔ صحافت نے اب نئے نئے روپ اختیار کر لیے ہیں اور اسے میڈیا کا نام دیا گیا ہے۔ با ایں ہمہ اس کے ان فرائض کے تلازم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حجاب اسلامی نے معاشرتی امور کو اپنے دائرۂ کار کے طور پر اختیار کیا اس کے موجودہ اور سابقہ شماروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا

ہے کہ اس کے ایڈیٹر شمشاد حسین اوران کے شرکائے کار اس کارِ خیر کو نہایت خلوص کے ساتھ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح کی ساری فلاحی اوراصلاحی تحریکوں کو دیکھنے اور سننے کے بعد ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اب معاملہ پرنٹ میڈیا کی حدوں سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اس لیے اگر واقعی عوام تک رسائی حاصل کرنی ہے تو الیکٹرانک میڈیا کا دامن پکڑنا ضروری ہے۔ سوشل میڈیا نام کی جو آندھی چل رہی ہے اس میں اپنے مرغولوں کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مطبوعات کو اپنا چینل بھی چلانا چاہیے اور غالباً چل رہے ہوں گے اس طرح ان کے اصل مقصد کی تکمیل کے ساتھ ہی ان کی تشہیر بھی ہوگی۔

◈◈◈

بازدیدِ حرم

نام کتاب : بازدیدِ حرم
مصنف : سہیل انجم

''آب'' و ''سنگ'' پر نقاشی کے بعد اس نقاشِ بہزاد رقم نے آب زم زم اور سنگِ اسود کے مبارک نقوش سے صفحات قرطاس کو مزین کر کے شرف بخشا ہے۔ وہ فنکار ہیں سہیل انجم جو محتاجِ تعارف نہیں۔ ایک ایسا جہاندیدہ اور جہاں آشنا صحافی جس کے قلم کی جولانی زمین سے آسمان تک ہے۔ کوئی دو درجن تصنیفات کے مصنف ہیں۔ میں ''کم پڑھ'' (ان پڑھ تو نہیں کہہ سکتا) ہونے کے باوجود ان کی کئی تصنیفات سے بہ سلامتی ہوش وحواس گزر چکا ہوں۔ فی الحال دو تصنیفات ''نقش برسنگ'' اور ''بازدیدِ حرم'' پیش نظر ہیں جو موصوف نے ایک حالیہ ملاقات میں عطا کی تھیں۔ ان کی دو تصنیفات ''نقش برآب'' اور ''نقش برسنگ'' دراصل خاکے ہیں۔ اول الذکر کا تعلق ان کے بزرگوں سے ہے، موخر الذکر میں دیگر احباب واصحاب کے خاکے ہیں۔ اس میں چند ایسے اصحاب بھی شامل ہیں جن سے میں واقف تو تھا لیکن کم آمیزی کی وجہ سے زیادہ وقوف نہیں تھا۔ سہیل انجم صاحب نے میرے لیے ان کی نقاب کشائی کردی۔ ''بازدیدحرم'' کے تعارفی مضمون بعنوان ''تقدیم'' میں ڈاکٹر

خورشید احمد شفقت اعظمی صاحب نے میرے لیے یہی کارِ خیر سہیل انجم صاحب کے معاملے میں انجام دیا۔ موصوف سے میری شناسائی تو عرصہ دراز سے تھی براہِ راست بھی اور ان کی تحریروں کے ذریعہ بھی لیکن کبھی اس بے تکلفی کی نوبت نہیں آئی جہاں لوگ گھلتے ملتے ہیں اور اچھی طرح شناسا ہوتے ہیں۔ اب وہ بے تکلفی نہ ہونے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ ان سے شناسا ہو گیا ہوں۔

فی الحال ''باز دید حرم'' کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ الحاج سہیل انجم صاحب کے دوسرے حج اور ایک درمیانی عمرہ کے بعد لکھی گئی، یہ کتاب ہے جو ایک طرح کا سفرنامہ بھی ہے، ایک روحانی سرشاری کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد قلبی کیفیات کا تذکرہ بھی۔ مزید براں اس پُر مشقت عبادت کے سفر کے عازمین کے لیے مشعلِ راہ بھی ہے، رہنما اور امکانات اور اندیشوں سے انتباہ اور احتیاطی تدابیر کے اشارے اور مشورے بھی ہیں۔ ان خوبیوں اور خواص کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ تحریر کی روانی ایک رننگ کمنٹری کا سا لطف دیتی ہے بس پڑھتے رہیے یا سنتے رہیے۔ بقول ان کے وہ لیپ ٹاپ لے کر گئے تھے چنانچہ جیسے یہاں اپنی اسٹوری فائل کیا کرتے تھے اسی طرح وہاں سے بھی روزانہ اپنے تاثرات کی ترسیل کرتے رہے۔

حج کے سفرنامے تو بہت لکھے گئے ہوں گے لیکن مجھے محض چند پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ان تصنیفات میں اکثر و بیشتر اپنے ذاتی محسوسات اور تاثرات رقم کیے گئے ہیں یا وہ مشکلیں اور مسائل جن سے وہ دوچار ہوئے۔ لیکن ''باز دیدِ حرم'' اس سے بہت مختلف ہے۔ اس میں ان جذبات اور احساسات اور تکلیفوں کا بیان تو بدرجہ اتم ہے، ان مشکلات اور مسائل کا بھی ذکر ہے جن سے انھیں اور ان کے ہم سفروں کو دوچار ہونا پڑا لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً بہتیرے مقامات مقدسہ اور تاریخی مقامات کی تفصیلات اور پس منظر، مختلف مقامات پر بازاروں کی کیفیت اور خرید و فروخت میں احتیاط کے مشورے۔

ارکان حج کے دوران سارے مقامات کے انتظامات دو طرح کے تھے ایک تو وہ جو ہر ملک کے حجاج کے لیے ان کے ملکی اداروں جیسے کہ حج کمیٹیوں یا معلّموں کی طرف سے کیے گئے تھے دوسرے وہ جو حکومتی اداروں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ سہیل انجم صاحب نے ان دونوں طرح کے انتظامات کی خوبیوں اور خامیوں کا بہت تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور دونوں طرح کے اداروں اور تنظیموں کو مشورے دیے ہیں۔ امید ہے کہ ہماری حج کمیٹیوں کے ذمہ داروں کی نظر سے وہ مشورے ضرور گزرے ہوں گے۔ اس کے بعد انھیں اصلاحی اقدامات پر غور کرنے کا موقع بھی ملا ہوگا۔ اگر ان کارروائیوں سے آئندہ حجاج کرام کی آسائشوں میں اضافہ ہوا ہو تو یقیناً سہیل انجم صاحب اس کارِ ثواب کے لیے عنداللہ ماجور ہوں گے۔ انھوں نے بعض دوسرے ملکوں کے حجاج سے گفتگو کر کے ان کے حالات بھی معلوم کیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے متعلق انتظامات بہتر تھے اور انھیں راحت ملی۔

دراصل اس قسم کی تحریروں کی مقامی زبانوں میں بالخصوص ہندی میں اشاعت کی ضرورت ہے۔ اس میں رسم الخط اور زبان کے مسائل ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سوشل میڈیا کا استعمال ان دونوں مسائل کا بہترین حل ہے۔ سادہ اور عام فہم مقامی زبان خصوصاً ہندی میں ایک تو ان نشریات کی رسائی بہت دور تک ہوتی ہے اور ان کی مسلسل تکرار بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے اس طرح کے نشریات ہوں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

مقاماتِ مقدسہ بہترین تجارتی مواقع فراہم کرتے ہیں جو یوں تو سال بھر جاری رہتے ہیں لیکن حج کا زمانہ انتہائی تجارتی سرگرمیوں کا ہوتا ہوگا۔ میرا قیاس ہے کہ ان بازاروں میں چینی مصنوعات کی فراوانی ہوگی اور وہ نسبتاً اور مقابلتاً سستی بھی ہوں گی کیونکہ وہاں اجرتیں بالعموم کم ہوتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس تجارت میں ہندوستان کا کوئی حصہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس قدر ہے۔ ہماری ریشم سے متعلق مصنوعات مثلاً پارچہ جات اور

لباس کے لیے اور ممکن ہے معدنیاتی مصنوعات کے لیے بھی کافی گنجائش ہوگی۔مگر ان ساری تجارتوں میں شاید چین سے مسابقت مشکل ہوگی خصوصاً قیمتوں کی وجہ سے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہاں اجرتیں کم ہوں گی ہمارے یہاں بھی اجرتیں کم ہی ہوتی ہیں بلکہ بہت کم ہوتی ہیں اگر مصنوعات اور برآمدات کی قیمتیں مقابلتاً کم نہ ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نفع کا بڑا حصہ درمیانی لوگ مار لیتے ہیں۔سرکاری مشنری اس معاملے میں ضروری اقدامات کر کے ہماری برآمدی تجارت کو نفع بخش بنا سکتی ہے اور بڑھا بھی سکتی ہے۔جنوبی ہند سے مسالوں کی تجارت تو عرب زمانۂ قدیم سے کرتے آئے ہیں معلوم نہیں اب کیا صورت ہے اور اس کو فروغ دینے کی مزید کتنی گنجائش ہے۔عطریات کی صنعت میں صندل اور اگر کا بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان کی بھی وافر پیداوار ہوتی ہے ان کی برآمد کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

پھلوں اور میوے کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو بحیرہ روم کے اطراف کے علاقوں سے بکثرت آتے ہوں گے اور ان کی بہترین اقسام بھی ہوں گی لیکن آم ایک ایسا پھل ہے جو لذت میں ہندوستان جیسا کہیں نہیں ہوتا، یہاں آام کی دوسو سے زیادہ قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام تو واقعی لا جواب ہیں۔خود ہمارے باغ میں ایک آم کی تخمی اور قلمی دونوں قسمیں موجود تھیں جو شروع سے ہی میٹھے ہوتے تھے، امیا بھی میٹھی ہوتی تھی ایسی اقسام کو فروغ دیا جاسکتا ہے، انھیں ڈبہ بند کر کے بھی برآمد کیا جاسکتا ہے۔

◈◈◈

دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات

نام کتاب: دبستان شبلی کی فارسی خدمات
مصنف : ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی

شبلی اور سرسید کے فیوض و برکات کے چشمۂ سرمدی سے سرشار ہونے والے تو دنیا کے ہر گوشے میں عرفان و آگہی کی مشعلوں سے دینی اور دنیوی مجلسوں پر ضیا پاشی کررہے ہیں، لیکن ایسے لوگ کم ہی ہوں گے جنھیں علم و عرفان کے اصل منبع کا بھی علم ہو۔ سب سے پہلے اسی منبعِ اقدس کی طرف اشارے کی غرض سے حسبِ ذیل اقتباس پیش ہے:

''قاضی علی اکبر چریاکوٹی کی شخصیت ہندوستان کی علمی، ادبی، مذہبی، تعلیمی اور تحریکی حیثیت سے انتہائی اہم تھی۔ آپ محقق، مورخ، مبصر اور مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ قانون داں بھی تھے۔ غازی پور ہی میں نہیں بلکہ پورے مشرقی یوپی میں آپ کی شہرت اور مقبولیت بحیثیت وکیل کے بھی تھی۔ مولانا عنایت رسول عباسی اور مولانا فاروق چریاکوٹی آپ ہی کے صاحبزادگان تھے۔ ان دونوں لائق و فائق اولادوں نے بیک وقت ہندوستان کی تمام تحریکوں کو تقویت بخشی۔ مولانا عنایت الرسول نے سرسید کو جدت اور مستقبل کا نسخہ عطا کیا تو مولانا فاروق چریاکوٹی نے شبلی کو شریعت و حمیت کا درس دیا۔''

یہ عبارت ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی کی تصنیف ''دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات'' سے ماخوذ ہے۔اس تصنیف کے ٹائٹل سے جو کچھ مترشح ہے وہ تو اس کا اصل جز اور بڑا حصہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو مشمولہ تذکروں سے کم اہم نہیں ہے کیونکہ اعظم گڑھ کے متعلق مولانا اقبال سہیل (جن کا تذکرہ کتاب ہذا میں قدرے تفصیل کے ساتھ شامل ہے) کا قول صادق ہے:

''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِّ اعظم ہوتا ہے''

آج اس صدابہار صنوبروں کے چمن پر تہمتوں کی بادِ سموم کی جو یورش جاری ہے اس کے پیشِ نظر شاہد نوخیز کی اس کاوش کو جو اس خطہ کی دور افتادہ آبادیوں کو جہاں دینی اور دنیوی علوم کے سبزہ زار لہلہا رہے تھے متعارف کرانے کے ضمن میں ہے تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔طوفانِ نا آگہی کے اس دور میں میرے خیال سے اس کی ضرورت شدید تر ہے اور مصنف موصوف کی پیہم متعدد تصنیفات اور ان کے وطنی جذبے سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس فرض کفایہ کی طرف توجہ دیں گے لیکن یہ کام حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پرسکون ماحول میں کرنے کا نہیں۔اس کے لیے اعظم گڑھ کے اطراف میں واقع مواضعات کی خاک چھاننے کے لیے آبلہ پا دوڑنا ہوگا تب جا کر اقبال سہیل کے شعر کی تفسیر رقم ہوگی۔

تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل زیرِ نظر تصنیف دیباچہ اور متفرقات اور تصویروں کے آخری دو صفحات کے علاوہ دراصل چار مضامین پر مشتمل ہے ہر مضمون کو اس کی طوالت اور مشمولات کے اعتبار سے ایک باب کہنا چاہیے لیکن صاحب تصنیف نے اس طور سے تبویب نہیں کی ہے۔ہر مضمون یا ہر باب کے آخر میں حوالہ جات اور کتابیات کی ایک مبسوط فہرست دی گئی ہے، جس کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کے دوران شب و روز مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ کیا ہوگا لیکن ان کی اس کاوش نے اس کتاب کو بلکہ اس کے ہر

باب کو ایک تحقیقی مقالے کی حیثیت دے دی ہے جو اس راہ میں کسی تحقیقی کام کرنے والے کے لیے رہنما بن سکتا ہے۔ اس کتاب میں جو چار خاص مضامین ہیں جنھیں میں باب کہتا ہوں حسب ذیل ہیں، اعظم گڑھ تاریخ کے آئینے میں، دارالمصنفین کے بانی شبلی کے احوال و افکار، دارالمصنفین کے رفقاء کی فارسی خدمات اور دارالمصنفین سے وابستہ ادباء وشعراء و محققین کے کارنامے۔ ان میں سے ہر ایک باب الگ الگ ایک ایک کتاب کی تصنیف کا طالب ہے۔ نوجوان مصنف شاہد نوخیز کا قلم گزشتہ چند برسوں کے دوران کتب اور مضامین کی تخلیق وتصنیف کے معاملے میں جس قدر زرخیز رہا ہے اس سے کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں کی تصنیف کے بارِ گراں کو بھی اپنے مضبوط اور کار آزمودہ کندھوں پر اٹھالیں۔

شبلی نعمانی سے متعلق مضمون تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے، جن میں علامہ شبلی کے وطنی اور خاندانی حالات، تعلیمی اکتسابات، سرسید احمد خاں کے ساتھ ان کے کھٹے میٹھے تعلقات، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، ندوۃ المصنفین اور دارالمصنفین کے درمیان ایک ذہنی رشتے کے تسلسل کے علاوہ پارہ صفت مضطرب مزاج مولانا شبلی کی سریع الحرکتی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ان کی بیشمار تصنیفات میں سے الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کے تذکرے ہیں جن سے ان کتابوں میں ذرا جھانک لینے یا انھیں ذرا چکھ لینے کا لطف آتا ہے لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ان کتابوں کو پڑھنے کی تحریک ملتی ہے گویا دیے سے دیے جلتے چلے جاتے ہیں۔ شعرالعجم کا تذکرہ ذرا تفصیل سے ہے۔ فارسی شاعری پر ایک سیر حاصل تنقیدی تصنیف کے بارے میں یہ بات مناسب اور مفید ہے کہ اس کی پانچ جلدیں پڑھنے کی زحمت کے بغیر اس کے مشمولات کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ خود شبلی نعمانی اور دارالمصنّفین پر بیشمار تصنیفات دنیا کے ادب میں قبولِ عام کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے موجودہ مضمون کو ایک اجمالی اشاریہ کہا جاسکتا ہے یا اگلے دو مضامین کی تمہید بھی کہا جاسکتا ہے جو معلومات اور افادیت کے اعتبار

سے کسی طرح کم نہیں اور جیسا کہ ''دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات'' کے عنوان سے ظاہر ہے کتاب کا اصل موضوع وہی ہیں۔

ان دونوں ابواب ''دارالمصنفین کے رفقاء کی فارسی خدمات'' اور ''دارالمصنّفین سے وابستہ ادباء وشعراء ومحققین کے کارنامے'' دراصل دوسو سے کچھ زیادہ صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون ہے، جسے دو حصوں میں اس طرح تقسیم کردیا گیا ہے کہ پہلے حصے میں مولانا شبلی نعمانی کے مقربین اور رفقاءِ کار کے حالات اور ان کی تصنیفات کے تذکرے اور اقتباسات ہیں اور دوسرا حصہ فارسی نظم ونثر میں گہر پاروں کو پیش کرنے والے ان اربابِ علم پر مشتمل ہے جو دارالمصنّفین سے براہِ راست وابستہ نہ تھے۔ ان دونوں زمروں میں شامل لوگوں کے مختصر حالات کہیں قدرے تفصیل کے ساتھ بھی اور ان کی تصنیفات کے اقتباسات بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے زمرے میں مولانا سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عمیر الصدیق ندوی اور دوسرے زمرے میں مولانا اقبال سہیل، مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان حضرات کی بیش بہا تصنیفات کا تذکرہ تو درکنار، ان کی فہرست بھی اس مختصر تبصرے میں شامل کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کی بے مثال اور لازوال تصنیف سیرۃ النبی کا اشارہ مل جاتا ہے اسی طرح سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصنیفات بزم تیموریہ اور بزمِ مملوکیہ دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ ان تصنیفات کی ادبی حیثیت کے علاوہ بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ مغل شہنشاہوں اور ان کے پیشرو مملوک سلاطین کی علم پروری، علم دوستی اور تصنیفی کاوشوں پر تاریخ کی دبیز گرد جمی ہوئی ہے اور مورخوں نے ان کی کردارکشی کی نیت سے صرف ان کی سپہ گری اور ہوس ملک گیری پر روشنی ڈالی ہے۔ دراصل ان تصنیفات کا دیگر زبانوں میں خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کرکے ان کی اشاعت کی ضرورت ہے شاید ابھی دنیا تشنگانِ علم اور طالبان حقیقت سے بالکل خالی

نہیں ہوئی ہے شاہد نوخیز نے ان کے تذکروں سے اس ضرورت کی یاددہانی کرادی ہے۔اقبال سہیل سے متعلق حواشی میں ایک تصنیف ''ربا کیا ہے'' کا ذکرنہیں ہے۔ان کی یہ کتاب ۱۹۳۰ء کے عشرے میں شائع ہوئی تھی جس میں انھوں نے قرآن اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس ربا کی تحریم ہے وہ دراصل موجودہ سود سے مختلف تھا۔ غالباً وہ ایک متنازعہ تصنیف رہی ہوگی۔۱۹۹۰ء کے عشرے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، ایڈیٹر ملی گزٹ نے اس کتاب کی ایک کرم خوردہ کاپی برآمد کی۔اس کی نئے سرے سے اشاعت کی۔اس میں نفس مضمون کی تائید میں چند تازہ فتاوے بھی شامل کیے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی What is Riba? کے عنوان سے کیا گیا۔جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر اردو داں حلقوں کو بھی اس تصنیف سے متعارف کرایا جائے۔ اتفاق سے اس کا انگریزی ترجمہ میں نے ہی کیا تھا۔اس وقت اس کے تذکرے کا مقصد صرف اقبال سہیل کی ایک مختلف جہت کی تصنیف کی طرف توجہ دلانا ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں بی بی سی لندن سے نشر ہونے والے ایک طویل انٹرویو کے دوران دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس ادارے کی مطبوعات اور ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں انتہائی اعتماد اور وثوق کے ساتھ جو کچھ کہا تھا اس کے محض چند جملے یہاں نقل کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا:

> ''میں اپنی مطبوعات سے اندازہ کرتا ہوں۔ ہمارے یہاں کی ایک مشہور کتاب سیرۃ النبی ہے۔ ہندوستان میں اس کی اتنی مانگ ہے کہ ہم سپلائی نہیں کرپاتے۔اسی طرح ہماری دیگر مطبوعات بھی ہیں۔ ہم اللہ کے فضل سے اپنی مطبوعات کے سہارے پورے ادارے کو چلا رہے ہیں...... دارالمصنّفین شبلی اکاڈیمی کے باہر شبلی کالج ہے...... وہاں ہر سال بی اے میں دو ڈھائی سو طلباء کا داخلہ ہوتا ہے اور اردو کے کئی

> کئی سکشن ہوتے ہیں تو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ نئی نسل اردو پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے......آپ اس کی فکر تو مطلق نہ کریں کہ اردو کا مستقبل ہے کہ نہیں کیونکہ جو زبان زندہ رہنے والی ہے اس کو کوئی قوت مار نہیں سکتی۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ زبان زندہ ہو کے ہی رہے گی۔''

اب میں اس تصنیف کے پہلے مضمون کی طرف آتا ہوں ''اعظم گڑھ تاریخ کے آئینے میں'' یہ باب کوئی ۹۰رصفحات پر محیط ہے۔ اس میں اعظم گڑھ کی تاریخ اور جغرافیہ کی تفصیلات کے علاوہ اطراف کی کئی معروف آبادیوں کے مختصر تذکرے اور وہاں سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کے حوالے بھی شامل ہیں۔ یہ تذکرے اور تعارفات کراتے ہوئے شاہد نوخیز نے دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات کے ملحوظات اور تقاضوں کو طاق پر رکھ دیا اور اردو میں شاعری کرنے والے اساتذہ اور ان کی اردو شاعری کی مثالیں پیش کیں ان میں شاہ گڑھی (سگڑی) کے ممتاز بزرگ شاعر محفوظ الرحمٰن ہمدمؔ شاہ پوری کا تفصیلی تذکرہ اور ان کی نظموں کے بکثرت حوالے پیش کیے ہیں جو اعظم گڑھ کی تاریخی اہمیت سے لے کر حالیہ واقعات اور حالات تک کا احاطہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں فی زمانہ یہ کام فرض کی حد تک ضروری ہے۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کے حوالے سے صرف چریا کوٹ تک بات کو محدود نہیں رکھا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ شاہد نوخیز نے جس کارِ خیر کی ابتدا کی ہے اس راہ میں بہت کچھ کرنے کو باقی ہے۔ میں اشارتاً دو باتیں کہنا چاہتا ہوں ایک یہ کہ اعظم گڑھ جونپور کمشنری کا حصہ تھا اور بیسویں صدی کے آغاز پر اس کو ایک الگ ضلع کی حیثیت دی گئی، اسی وجہ سے علمائے جونپور میں سے بہتیرے ایسے ہوں گے جن کے تذکروں میں ان کی نسبت جونپور سے بیان کی گئی ہوگی جبکہ اصلاً ان کی نسبت اعظم گڑھ کی ہوگی اور اب مئو کا

ضلع الگ ہوجانے کے بعد بہتیرے اصحابِ علم ایسے ہوسکتے ہیں، جن کا تذکرہ مئو کے حوالے سے ہو، جبکہ ان کی نسبت اعظم گڑھ سے ہونی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ لعل و گہر کی قدر افزائی اپنے معدن اور مخزن سے نکل جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اپنی جگہ پر ان کی پرکھ نہیں ہوتی۔ غالباً اس کیفیت کا نفسیاتی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ان مشاہیر کو اپنی اصل و نسل کی طرف مراجعت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ہمارا فاروقی گھرانا۔ اس گھرانے کے افراد نے فاروقی نسبت تو برقرار رکھی وہ ایک مجبوری ہے کہ والدین نے روایتی طور پر اس نسبت کو نام سے جوڑ دیا تھا لیکن انھوں نے پلٹ کر کوریا پار کی طرف نہیں دیکھا گو دنیا بھر میں نام اور دام کماتے رہے۔ مولانا اطہر مبارکپوری نے اپنی تصنیف ''علمائے اعظم گڑھ'' میں جن علما کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے سات کا تعلق کوریا پار سے تھا۔ ان میں مولانا علی احمد صاحب کا نام شامل ہے۔ وہ مدرسہ اصلاح، سرائے میر میں شیخ الحدیث تھے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے ص ۱۷۲ پر ان کا ذکر ہے۔ کوریا پار یا کوئریا پار کے ذیل میں بھی اس وقت کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس موضع کا تذکرہ کتابِ ہٰذا کے صفحہ ۵۰ پر ہے۔ ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' نجم الرحمٰن فاروقی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے والد خلیل الرحمٰن فاروقی کی تصنیف ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی کے والد ہیں۔ نجم الرحمٰن فاروقی نے اپنے نانیہالی خاندان کا ایک شجرہ مرتب کیا جس میں اپنے دادیہال کوریا پار کا ذکر بھی شامل کرلیا ہے، جسے انھوں نے اپنے والد کی تصنیف ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اسی جگہ کوریا پار کے نام پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تسمیہ تو کوڑیا شاہ کی نسبت ہے جو محترم خلیل الرحمٰن بھائی نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ دوسری وجہ میرا وہ قیاس ہے جو کوریا پار اور ولید پور کے درمیان آباد ایک مسلم کوئری (سبزی کاشتکار) برادری سے ہے جو زیرِ تبصرہ کتاب کے صفحہ ۵۱ پر مذکور ہے۔ لیکن آگے بڑھ کر صفحہ ۵۲ پر شاہد نوخیز نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جہانگیر نے دولت خاں کو جو ۲۴ پرگنوں کی ریاست

عطا کی تھی، وہ آج کل دو تین ضلعوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اس طرح ہیں پرگنہ نظام آباد، پرگنہ گوڑیہ، پرگنہ تلہنی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد، پرگنہ گھوسی وغیرہ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ محمد آباد اور گھوسی کے درمیان تقریباً دونوں طرف سے برابر فاصلے پر موضع کوریا پار واقع ہے۔ ایسا تو نہیں کہ ''گوڑیہ'' کی بگڑی ہوئی شکل کوریا اور پھر کوریا پار ہے۔ یا یہ موضع اسی پرگنہ گوڑیہ کا حصہ ہے۔ اگر پرگنہ گوڑیہ کا محل وقوع اور اس کے حدودِ اربعہ معلوم ہوسکیں تو حقیقتِ حال واضح ہوسکتی ہے اس کا ریکاڈ اعظم گڑھ یا جونپور کی کلکٹری کچہری کے محافظ خانے میں ضرور ہوگا۔ لیکن اس کو تلاش کرنا، برآمد کرنا اور دیکھنا جوئے شیر لانے سے کم محال نہ ہوگا۔ صرف ایک معاملے میں نہیں بلکہ کئی دیگر آبادیوں اور وہاں کی قابلِ ذکر شخصیات کے بارے میں تحقیق کو ایک فرض کفایہ سمجھ کر شاہد نو خیز انجام دے ڈالیں تو دراصل ایک نئی تاریخ کی دریافت کے مترادف ہوگا۔

اب آخری بات جس پر خاص طور سے توجہ دلانا ضروری ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں پروف کی بیشمار غلطیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے اس وقیع تصنیف کے صفحات سے گزرتے ہوئے بڑی گرانی محسوس ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر مصنف خود پروف ریڈنگ کرتا ہے تو اس کا ذہنی تحفظ غلطیوں پر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کام ہمیشہ ماہر پروف ریڈر کے حوالے کرنا چاہیے۔ ان کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے کیونکہ اردو زبان کی اچھی تعلیم عام نہیں ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ٹائپسٹ یا کمپوزیٹر حضرات اپنے طور پر ٹائپ کرتے چلے جاتے ہیں گویا انگریزی ٹائپ کرنے کے لیے صرف اے سے زیڈ تک حروف تہجی کو پہچان لینا جیسے کافی ہے اسی طرح اردو قاعدے سے ابجد کو دیکھ کر اس کی مشق کرنا کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو الفاظ میں صوتی یکسانیت رکھنے والے حروف، ان کے محل استعمال اور انھیں باہم جوڑنے کے مختلف طریقوں کی مہارت ضروری ہے۔ ''دبستانِ شبلی کی فارسی خدمات'' جیسی کتاب صرف ادبی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ آئندہ مقالہ نگاروں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بھی

بن سکتی ہے اور اس کے اقتباسات نقل کیے جاسکتے ہیں تو کیا وہ اقتباسات من وعن اصل غلطیوں کے ساتھ نقل کیے جائیں گے اور انھیں سند کی حیثیت دے دی جائے گی یا ان کی اصلاح کی جائے گی۔ یہ نہایت اہم نکتہ ہے اس پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

◈◈◈

اودھ کے فارسی گوشعراء

نام کتاب : اودھ کے فارسی گوشعراء

مصنفہ : ڈاکٹر زہرہ خاتون

ہمارے برصغیر کا سارا شمالی خطہ مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل پر محیط ایک ایسا سبزہ زار ہے جو قدرت کی صناعیوں اور حسن کاریوں کا شاہکار ہے۔ زرخیزی اور مردم خیزی دونوں اعتبار سے بے مثال ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاہان ذوالجلال اور بزرگان عظام کتنے ہی ہفت خوانوں سے گزرتے ہوئے یہاں آتے رہے اور دنیاوی اور روحانی مسرتوں سے سرشار ہوکر یہیں اپنا مسکن اور محور بناتے رہے۔ قدرت نے فلک بوس کوہساروں کی فصیل سے اور ناپیدا کنار سمندروں کی باڑھ سے مسدود و محصور کر کے اس خطے کو نوع انسانی کی پرورش اور اس کی تہذیب کی مشاطگی کے لیے محفوظ و مامون بنایا۔ چنانچہ زمانۂ قدیم میں آریائیوں سے لے کر عہدِ حاضر تک باہر سے آنے والی قوموں اور تہذیبوں کی میزبانی کا شرف بھی اس خطے کو حاصل ہوتا رہا۔

ادب اپنے عہد اور زمانے کا سب سے زیادہ معتبر اور مستند شاہد اور راوی ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ، تہذیب، معاشرت، ریت رواج سب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہر دور کے ادب کو، خواہ وہ کسی زبان میں ہو، صرف محفوظ نہیں بلکہ زندہ رکھا جائے، تا کہ

آنے والی نسلیں اپنے ماضی کی شناخت میں اس سے استفادہ کرتی رہیں۔جس خطے کا ہم تذکرہ کررہے ہیں وہیں تقریباً ایک ہزار برس کی مدت مدید میں ایک ایسی رنگا رنگ تہذیب کی چمن بندی ہوئی جس کے تانے بانے میں سارے اجزائے ترکیبی کے رنگ اپنے سارے حسن و جمال کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہے تھے اوران کے آہنگ فردوس گوش و ہوش ہوتے رہے۔زیادہ صاف لفظوں میں کہا جائے تو مقامی زبانوں اور بولیوں سے باہر سے آنے والی اقوام کی زبانوں کے میل جول سے تہذیب کے اس تاج محل کی تدوین وتسویب ہوئی تھی۔ان زبانوں میں سے ایک فارسی تھی۔خطۂ اودھ کے مسند نشینوں کی سرپرستی اور ادب نوازی سے اس کا رنگ نکھرتا گیا۔

یہی جواز ہے اودھ کے ایک زریں عہد میں فارسی شعروادب کی بقا اور دوام کے لیے تصنیفات کو جاری رکھنے کا۔اسی سلسلے کی ایک کڑی ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' ہے جو ڈاکٹر زہرہ خاتون کی تصنیف ہے۔وہ زہرہ فاروقی کے قلمی نام سے لکھتی ہیں۔ان کی دوسری تصنیف ''نصابِ تصوف'' ہے۔جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے ادب معاشرے کے ہر پہلو کا آئینہ دار ہوتا ہے،صوفیہ کا طرزِ حیات معاشرے کے لیے ایک نہایت صالح اور صلح کل طریق حیات کا نمونہ پیش کرتا ہے۔آج زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار سے دوچار معاشرے کو اس نمونے کی یاددلانی ضروری ہے۔اس تصنیف کے ذریعہ یہی کام انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان تصانیف سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ فکر انسانی اپنے اظہار کے لیے کسی بھی زبان کا چولا اختیار کرسکتی ہے اور وہ زمین وزبان کی حدود وقیود سے آزاد و بے نیاز ہوتی ہے۔چنانچہ سرزمین فارس سے ہزاروں میل دور فارسی زبان نہ صرف فکری اظہار کررہی تھی بلکہ ایک صاف ستھری اور پرکشش تہذیب کے تانے بانے بن رہی تھی اور اس کارہنرمندی میں شریک ہونے والے مذہب وملت کی بندشوں سے بالکل بے نیاز ایک

تہذیب کی تازہ کاری کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر زہرہ خاتون کی تصنیف ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' دراصل برصغیر پر صدیوں کی مسلم حکمرانی کے زوال کا آخری منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس دردناک داستان پر فارسی گوشعراء کے احوال و آثار کی ایک میٹھی پرت چڑھا دی گئی ہے جس کی وجہ سے اصل حقیقت تلخی کے احساس کے بغیر حلق سے اتر جاتی ہے لیکن فکر کی گہرائیوں میں پہنچنے کے بعد اس کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ ''حرفِ آغاز'' کے زیرِ عنوان کتاب کا تعارفی مضمون (مرحوم) ڈاکٹر عبدالسلام، پروفیسر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ وہ اس داستان کا مختصر بیانیہ ہے۔

> ''آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا اور پھر عربوں کی حکومت سندھ میں قائم ہوئی۔ عربوں نے تقریباً تین صدیوں تک سندھ پر اپنی حکومت قائم رکھی اور اسی زمانے میں سندھیوں اور عربوں کے مابین لسانی اور معاشرتی اختلاط ہوا اور دونوں نے ایک دوسرے پر اپنے اپنے تہذیبی اثرات مرتب کیے، گیارہویں صدی عیسویں تک ہندوستان کے اس علاقہ میں آزاد اسلامی ریاستیں قائم رہیں۔ پھر گیارہویں صدی عیسوی میں صفّاریوں نے جو کہ ایرانی تھے سندھ پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا۔ اب ہندوستان کے لوگوں کا سابقہ عربوں کے علاوہ ایرانوں سے بھی پڑا اور ایرانی تہذیب و تمدن کا اختلاط ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ہوا اور ہندوستانیوں کو اب فارسی بولنے والی قوم کے ساتھ میل جول بڑھانے اور ربط ضبط رکھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اور اس طرح پہلی بار فارسی زبان باقاعدہ ہندوستان کی سرزمین پر وارد ہوئی۔ اور دھیرے دھیرے اپنی تمام تر خوبیوں اور حسن کاریوں کے ساتھ ہند کی سرزمین پر تیزی کے ساتھ پھلنے پھولنے لگی۔

پھر بعد کے آنے والے زمانے میں تو ہندوستان کے مسلم سلاطین نے اپنی علم پروری اور ادب نوازی کے ذریعہ فارسی زبان و ادب کو بڑی ترقی دی۔''

''آج کے جدید دور میں جبکہ علاقائی سطح پر ادب و تاریخ کا مطالعہ کیا جا رہا ہے تو یہ ضروری ہے کہ خطۂ اودھ کے فارسی ادباء اور شعراء کی خدمات کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے۔ اردو کے حوالے سے تو ماضی میں کئی مستند کتابیں لکھی گئی ہیں جیسے ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری''، ''اردو ادب کا سیاسی و سماجی پس منظر'' وغیرہ مگر فارسی ادبیات کے حوالے سے ابھی بھی علاقہ اودھ کا مطالعہ تشنہ ہے۔ شاید وقت کی اسی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے عزیزہ ڈاکٹر زہرہ خاتون نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' مکمل کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے فارسی ادب میں پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی اور اب وہ اپنی اس تحقیق کو کتابی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔''

زیرِ نظر تصنیف ۳۶۶ صفحات پر مشتمل اور چھ ابواب میں منقسم ہے۔ ابتدائی پانچ ابواب: اودھ کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نوابین اور شاہان اودھ کے (مختصر سوانحی خاکے)، نوابین اودھ کی تہذیبی اور سماجی زندگی، نوابین اودھ کی علمی و ادبی سرپرستی، دور نوابین اودھ کی چند اہم تصنیفات ہیں اس کے بعد کتاب کا چھٹا باب اودھ کے فارسی گوشعراء کے عنوان سے ہے جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔

اودھ کے تاریخی پس منظر کے سلسلے میں مذکور ہے ''اودھ یوں تو اساطیری بنیادوں پر ابتدا ہی سے قدیم ہندوستان میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔'' اس بارے میں باقر شمس لکھنوی کی کتاب ''تاریخ لکھنؤ'' سے حسبِ ذیل اقتباس پیش کیا گیا ہے:

''اودھ کے معنی وعدہ کے ہیں۔ رام چندر جی نے بن باس کی مدت پوری

کرنے کے بعد یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ کا شہر تھا۔ ایک مدت کے بعد اجودھیا دارالسلطنت اور اودھ پورے صوبے کا نام ہوگیا۔''

اس کے بعد سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیاتِ شبلیؒ'' سے ایک مبسوط اقتباس ہے جس سے اس خطے کی پوری تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

نوابین اور شاہانِ اودھ سے متعلق دوسرے باب میں ان کی ایک فہرست ہے جس میں تیرہ نام شامل ہیں جن میں سے صرف گیارہ کو اپنے عہد حکومت میں کچھ کرنے کا موقع ملا۔ بقیہ دو کا معاملہ یوں ہوا کہ مناجان کی حکومت محض چند گھنٹوں کی تھی اور مرزا برجیس قدر کو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اراکین سلطنت نے تحت نشین کیا تھا جسے انگریز کمپنی نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ فہرست نواب سعادت علی خاں برہان الملک سے شروع ہوتی ہے اور مرزا برجیس قدر سکندر جاہ پر ختم ہوتی ہے۔ اگلے تین ابواب انہی نوابین کے احوال وکوائف سے متعلق ہیں۔

شعراء سے متعلق چھٹے باب میں ایک سو شعراء کے احوال اور ان کے کلام کے نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۸/صاحبِ دیوان شعراء ہیں اور بقیہ ۷۲/ معروف شعراء میں شمار کیے گئے ہیں۔ ان میں حسب ذیل شعراء کے نام بھی شامل ہیں جو اردو شاعر کی حیثیت سے معروف ومشہور ہیں: انشاء اللہ خاں انشاء، مرزا محمد رفیع سوؔدا، غلام ہمدانی مصحفؔی، میر تقی میؔر، واجد علی شاہ اخؔتر، شیخ امام بخش ناسؔخ۔

آج جبکہ ہندوستان میں اردو زبان کی بقا کے لالے پڑے ہیں اور اہلِ اردو اس کے وجود کو تسلیم کرانے کی جدوجہد میں لگے ہیں فارسی کے سابقہ مقام کو سمجھنے سمجھانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ انکشاف یقیناً حیرت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اودھ کے فارسی گوشعراء کی اس فہرست میں ۳۸ ہندو شعراء کے نام شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی ایک محدود عہد یعنی ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱ء تا ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء کا احاطہ کرتی ہے لہٰذا اس خطہ کے علاوہ

ملک کے دوسرے حصوں میں اوراس عہد کے اگلے پچھلے زمانوں میں بھی فارسی زبان میں شاعری کرنے والے ہندوشعراء یقیناً موجود رہے ہوں گے۔ یہ حقیقت ہندوستان کی تہذیبی اورادبی رنگا رنگی پر دلالت کرتی ہے۔آج ان عظیم الشان روایات کی یاددہانی اورانھیں تازہ کرنے کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ یہی ضرورت اس تصنیف کی اہمیت اجاگر کرتی ہے،اسی لیے کہا گیا ہے'' گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ ٔ پارینہ را''۔

فارسی ادب و تاریخ کے طلبہ کے لیے یہ کتاب ایک مفید حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

◈◈◈

نقشِ ثانی

شمالی ہند میں خطۂ اودھ ایک تہذیبی شناخت رکھتا ہے لیکن اس شناخت کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے حدود زمانی کا قطعی تعین نہیں کیا جاسکتا تاہم وثوق کے ساتھ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نوابین اودھ کا دور جو ۱۳۴ برس پر محیط ہے اس تہذیب کے عروج کا دور تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کوئی ایک درجن نوابین اودھ کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ انھوں نے ادب نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

ڈاکٹر زہرہ فاروقی (زہرہ خاتون) نے اودھ کا عمومی اور ادب نواز نوابین کے عہد زریں کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور اس بحرِ مواج سے جو گہر ہائے آبداران کے ہاتھ آئے ہیں انھیں دو تصنیفات کی صورت میں گوہر شناسان ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ پہلی تصنیف ''اودھ کے فارسی گو شعراء'' نے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کی اور اب ''نقشِ ثانی'' پیشِ ناظرین ہے۔ ان دونوں اشاعتوں کے درمیان ایک طویل وقفہ کی تاویل مصنفہ نے حرفِ آغاز کے زیرِ عنوان اپنی تحریر میں خود بیان کی ہے۔

اول الذکر تصنیف میں ایک سو شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام کے نمونے شامل ہیں اور اس دوسری تصنیف میں مزید ایک سو شعراء کے احوال اور کلام کے نمونے شامل کیے گئے ہیں گویا اس دوسری کتاب کو پہلی کتاب کی تکمیلی شکل کہا جاسکتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کو نقشِ ثانی کا عنوان دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کو بھی اپنی پیشرو کی طرح مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابوں کو طالبانِ علم کے لیے ایک قابلِ

اعتماد حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ عین ممکن ہے کہ اودھ کے اس دفینے میں ابھی کچھ اور لعل و گہر کسی فرہاد کے منتظر ہوں۔

''نقشِ ثانی'' میں نوابین اودھ کے سوانحی خاکے کی شمولیت اور علمائے اودھ کی دینی خدمات کے تذکرے نے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھادی ہے۔ آخر میں اس تصنیف کے مآخذ کے طور پر جن کتابوں کی فہرست ہے ان کی تعداد ۶۵ ہے۔ اردو میں ان کتابوں کے علاوہ حوالے کی بارہ کتابیں انگریزی میں ہیں ان کے علاوہ چند رسالے اور پندرہ مائیکروفلمز ہیں۔ سابقہ کتاب ''اودھ میں فارسی گوشعراء'' میں حوالے کی کتابوں کی فہرست میں تقریباً دوسو کتابیں شامل ہیں۔ چنانچہ ان دونوں تصنیفات میں شامل حوالے کی کتابوں کی یہ طویل فہرست تحقیقی مطالعہ کرنے والے اور تحقیق کے طلبہ کی خاصی رہنمائی کرسکتی ہے۔

مناسب ہوگا اگر ڈاکٹر زہرہ فاروقی اپنی تدریسی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ان تذکروں کے فارسی میں ترجمہ پر بھی صرف کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہی کہ دنیائے فارس میں ان کتابوں کا اور مصنفہ کا تعارف ہوجائے گا، دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ شاید دنیائے فارس کو ہندوستان کے صرف ایک خطے میں اور وہ بھی ایک محدود زمانے میں فارسی زبان و ادب کی اتنی عمومیت اور مقبولیت پر حیرت ہوگی۔ حیرت تو آج ہندوستان میں بھی لوگوں کو ہونی چاہیے۔ اب دنیائے فارس ایران تک محدود نہیں رہی یہ افغانستان سے لے کر اطراف و اکناف کے کوئی نصف درجن ممالک پر سایہ فگن ہے۔ یورپ میں جابجا اس کی نوآبادیاں نظر آرہی ہیں۔ بیک وقت پھیلتی سمٹتی دنیا کے آپسی لین دین میں بھی فارسی زبان کے اثرات پھیلتے ہوئے صاف نظر آرہے ہیں، اس لیے مستقبل شناسوں کو اس راہ میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر کتاب کتب فروشوں کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی میں بھی دستیاب ہے۔ ◈◈◈

کشف المحجوب

نام کتاب : نصاب تصوف

مصنفہ : ڈاکٹر زہرہ خاتون

ڈاکٹر زہرہ فاروقی کی دوسری تصنیف ''نصابِ تصوف'' میں اس امر پر اصرار کیا گیا ہے کہ سید ابوالحسن علی ہجویری کی تصنیف ''کشف المحجوب'' دراصل علم تصوف کا نصاب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر دیگر علوم کی طرح تصوف بھی کوئی علم ہے تو اس کا نصاب ہونا چاہیے۔ کسی نصاب اور اس کے متعلقات کی تعریف اور تعین کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ ''کشف المحجوب'' پرکھ کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

حضرت ابوالحسن علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش کے متعلق ڈاکٹر ادریس صاحب اپنے تعارفی مضمون میں لکھتے ہیں کہ موصوف ''چوتھی پانچویں صدی کے مشہور بزرگ صوفی تھے اور غالباً شمالی ہند میں آنے والے پہلے صوفی ہیں جنھوں نے سلطان محمود غزنوی کی سپاہ کے ہمراہ آکر اسلام کی روشنی میں اپنی تعلیمات سے ہندوستان کو منور کیا آپ کی بزرگی اور عظمت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی (۵۳۷-۶۳۳ھ) نے دہلی تشریف لانے سے پہلے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی۔''

''شیخ ہجویری نے دس سال تک بیرونی سفر اور علماء و مشائخ سے استفادہ کرتے ہوئے لاہور میں آ کر مستقل سکونت اختیار کی اور رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔'' آپ کا سالِ وفات ۴۶۵ھ ہے۔

''ڈاکٹر زہرہ خاتون نے Curryculum, Syllabus اور Text پر پہلے باب میں طویل علمی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی بھی مضمون کی تعلیم و تدریس کے نظام میں ایک مرکزی مقصد ہوتا ہے جسے ہم متن کہہ سکتے ہیں، اس کے گرد پہلے حلقہ کو Curriculum اور دوسرے وسیع حلقہ کو Syllabus یا نصاب اور ان حلقوں کے باہر وسیع تر فضا کو Extra Curriculam کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ تصوف ایک علم ہے تو اس کا تدریسی ''نصاب کشف المحجوب'' ہے۔ نیز اس امر کی بھی تحقیق کی جائے کہ نصاب کی تعریفات پر یہ کتاب معتبر قرار دی جاسکتی ہے یا نہیں۔''

دوسرے باب میں حضرت علی ہجویری کے جو احوال دستیاب ہو سکے درج کیے گئے ہیں۔

باب سوم میں آپکی تصنیفات کا بیان ہے۔ آپکی بارہ تصانیف اور شعری دیوان ہے۔ جن میں شاہکار تصنیف کشف المحجوب ہی باقی ہے۔ اشعار کا دیوان تو ان کے بیان کے مطابق کوئی صاحب مستعار لے گئے لیکن واپس نہیں ملا۔ دیگر تصانیف بامرور زمانہ ناپید ہو گئیں۔ کشف المحجوب یقیناً تصوف کے موضوع پر پہلی معتبر کتاب ہے جو نثر میں لکھی گئی اور ہر دور میں صوفیہ نے نیز تصوف کے طلبہ نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

چوتھے باب میں کشف المحجوب کی تصنیف کے مقاصد میں ان پچاس نکات کی تفصیل ہے جو اس کتاب کی اساس ہیں۔ یہ تمام نکات قرآن مجید اور احادیث سے ہی اخذ کردہ ہیں۔

پانچویں باب میں ''کشف المحجوب کو تصوف کے تدریسی نصاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تصوف کے موضوع پر فارسی میں یہ قدیم ترین کتاب ہے جو تصوف کے اسرار و

رموز کے بیان میں بلاشبہ ہر دور میں معتبر تسلیم کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ادریس احمد صاحب نے اپنے تعارفی مضمون میں زیرِنظر تصنیف کا مختصر ترین لیکن نہایت جامع تعارف کرادیا ہے۔ میرے لیے خود اپنی طرف سے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نصابِ تصوف پر پوری بحث کو کم سے کم جگہ میں مصنفہ کے الفاظ میں پیش کردیا جائے۔ اس تصنیف کا کمال یہ ہے کہ اس میں موضوع بحث کے ساتھ ساتھ سید ہجویری کی تعلیمات کو بھی پیش کیا گیا ہے اس طرح اس کتاب کے قاری کو علم تصوف کے متعلق ان کے نظریات کا بھی علم ہوجاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مصنفہ نے علم تصوف کے بارے میں خود نہ کوئی رائے قائم کی ہے نہ اس کو بیان کیا ہے، جو کچھ ہے سید ہجویری کی تعلیمات کے حوالے سے ہے۔ پہلے باب اول کے اس ابتدائی اقتباس پر نظر ڈالیں:

> ''وہ علم کون سا ہے جس کی ہنوز دریافت لازم ہے اگر اسی علم کا نام ''تصوف'' ہے اور اس کے شناسا صوفیۂ کرام ہیں تو اس علم کے حدود اربعہ کیا ہیں، اس کا درس کیسے اور کس سے لیا جائے انسان کی یہی مشکل تھی جس کو آسان کرنے کے لیے، اس کی وہی حیرانی تھی جس کو دور کرنے کے لئے ایک مرد خدا نمودار ہوا۔ ''مردی از غیب برون آید و کاری بکند''۔ وہی مرد خدا سید علی بن عثمان ہجویری عرف ''داتا گنج بخش'' کی ذات بابرکات ہے جس نے اس روحانی علم کے اجزائے ترکیبی بیان کئے ہیں۔''

اس کے بعد نصاب اور اس کے تلازمات پر پوری بحث ہے جس کا اختتام یوں ہوتا ہے:

> ''اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مخصوص مضمون یعنی تصوف کی تعلیم کے لئے نصاب کے مطابق جس متن کی ضرورت ہے وہ متن نصابی تلازمات کی تکمیل بھی کرتا ہے یا نہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ تلازمات خود متن کے اندر مذکور ہیں اس لئے ان

کی پرکھ کی جائے کہ نصاب کی تعریفات پر یہ کتاب پوری اترتی ہے یا نہیں۔ یہاں یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ کوئی زبان پہلے وجود میں آتی ہے، اس کے بعد اس کی گرامر وضع کی جاتی ہے تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم نے پہلے کشف المحجوب کو ایک نصاب قرار دیدیا ہے اور اب اس کو گرامر کے فریم میں فٹ کررہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ گرامر کا وہ فریم پہلے سے موجود ہے اور اس سے الگ کشف المحجوب بھی موجود ہے۔ ہم صرف کتاب پر اس گرامر کا اطلاق کرکے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ کتاب اس گرامر کے عین مطابق ہے۔''

باب دوم سید ہجویری کے احوال پر مشتمل ہے:

''نسب شریف ان کی اس طرح سے زبانی مجاورین کے ظاہر ہوئی کہ حضرت علی گنج بخش بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمٰن ابن سید عبداللہ ہجویری بن سید ابوالحسن علی بن سید حسن بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن بن حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا، کرم اللہ وجہہ۔''

تین قطعات کے جو اشعار آپ کے مزار پر نصب ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ وفات ۴۶۵ھ یا اس کے آس پاس ہے۔

''آپ کے ازدواجی حالات سے متعلق تذکروں میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ سوائے اس کے کہ آپ کی شادی ضرور ہوئی تھی مگر کچھ ہی مدت کے بعد، مفارقت کا سامنا ہوگیا اور پھر تا حیات آپ کسی دوسرے رشتہ سے منسلک نہ ہوسکے۔ آل اولاد کے متعلق بھی کسی تذکرہ نویس نے یا خود آپ نے کہیں کوئی ذکر نہیں کیا۔''

آثار سید ہجویری کے تحت تیسرے باب میں حضرت کی تصنیفات کا تذکرہ ہے۔ ''آپ کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے جس میں شاہکار کشف المحجوب ہے۔...... افسوس کہ بیشتر آثار آپ کی زندگی میں ہی ناپید ہوچکے تھے۔ ان کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے۔''

اس جائزے میں صرف بارہ کتابیں شامل ہیں۔

باب چہارم، ''کشف المحجوب: مقاصد وتعلیمات'' دراصل یہی باب اس تصنیف کا حاصل ہے۔

''امور شریعت، اسرار طریقت، صوفیہ کے احوال اور اقوال وغیرہ لکھنے کا سید ہجویری کا خاص مقصد یہ تھا کہ لوگ کتاب وسنّت نبویؐ کی روشنی میں صحیح راستہ کا تعین کریں، حقائق کو اختیار کریں، برائیوں اور گناہوں سے حتی الوسع گریز کریں، بدعات کی تاریکیوں میں نہ بھٹکیں اور کسی بھی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ یہ کتاب ایک ایسا گنجینہ اقوال واحوال ہے جسے اہل تصوف بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آیئے اب اس نصابی کتاب کا مقصد اور سید ہجویری کی تعلیمات پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لیں۔''

''سید ہجویری کی تعلیمات کا محور صرف اور صرف قرآن واحادیث اور اقوال ہیں اس سے الگ ہٹ کر وہ کسی بھی نظام حیات کو قابل ستائش نہیں سمجھتے چنانچہ ذیل میں پچاس نکات اُنکی تعلیمات سے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔''

پانچویں باب میں ''نصاب تصوف یعنی کشف المحجوب'' کے بارے میں لکھا گیا ہے:

''اسلام میں تصوف کا تصور صحابۂ کرامؓ کے زمانہ مبارک سے ہی قایم ہوگیا تھا، تاہم اس اصطلاح کا استعمال دوسری صدی ہجری میں مختلف تصنیفات میں ظاہر ہوا۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں (۳۰۹ھ/۹۲۲ء) حسین بن منصور حلاج کے قتل نے صوفیوں کی دنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا کردیا چنانچہ یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اصل تصوف کیا ہے نیز طریقت اور شریعت کا باہمی تعلق کیا ہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے تصوف کے موضوع پر جامع تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔''

''تذکرہ نویسوں کے مطابق اس کا پورا نام ''کشف المحجوب لارباب القلوب''

ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا نام کشف المحجوب کیوں رکھا گیا، اگر اس کی وجہ تسمیہ پر گفتگو کریں تو اس کے لئے ایک الگ ہی باب درکار ہوگا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ جو اہل دل، اہل طریقت ہیں انکے جو بھی اشغال و اعمال ہیں انہیں واضح طور سے اس طرح بیان کرنا کہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب راہ حق کے بیان، کلمات حق کی شرح اور حجاب بشریت کے کشف میں لکھی گئی ہے، اور اگر مصنف کے مقدمہ پر غور کیا جائے تو سید ہجویری کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ابوسعید ہجویری کی درخواست پر لکھی گئی۔ بالخصوص اُن سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو ابوسعید ہجویری نے سید صاحب سے کئے تھے۔''

ابوسعید ہجویری کے سوالات گیارہ نکات پر مشتمل تھے۔سید ہجویری نے ان تمام سوالوں کے جواب کشف کی صورت میں علمی دلایل و براہین اور قرآنی آیات و احادیث کے ساتھ پیش کئے ہیں۔اس کتاب میں جہاں تصوف کی حقیقت اور اسکے رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی اس کی تعلیم و تدریس کے مطابق تربیت کی ضرورت بھی بیان کی گئی ہے۔

کشف المحجوب کے مشمولات میں سب سے پہلا موضوع حصولِ علم ہے جس کی اہمیت قرآن اوراحادیث کے مختلف حوالوں سے بیان کی گئی ہے۔اگلا موضوع فقر و درویشی ہے۔

فقیر کے باب میں کہتے ہیں کہ فقیر یا درویش وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو، اور نہ ہی اس کے نہ ہونے سے اُس فقیر کو کوئی محتاجی ہو، گویا اسباب کا ہونا یا نہ ہونا دونوں ہی کیفیات اس کے فقر میں یکساں ہیں۔

اس کے بعد نصاب کا اگلا موضوع تصوف سے متعلق ہے، یعنی تصوف کیا ہے، اس کے معنی کیا ہیں، اس کی قسمیں کیا ہیں، صوفیہ کسے کہتے ہیں ان کے اوصاف و آداب نیز اخلاق، صوفیہ کے بنیادی خصائل، ان کے معاملات، رہن سہن، لباس پوشاک مریدی کی

تربیت، غرض کہ چھوٹی سے چھوٹی کسی بھی بات کو اس موضوع سے متعلق تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

صوفیہ کرام کے بعد اس نصاب کا اگلا موضوع خلفائے راشدین، اہل بیت، اصحاب صفّہ نیز تبع تابعین پر مشتمل ہے اس حصہ میں تقریباً چونسٹھ (۶۴) لوگوں کے تذکرے شامل کئے گئے ہیں جو چودہ (۱۴) ابواب میں منقسم ہیں۔ اس کے بعد اس نصاب کا اہم موضوع صوفیہ کے مختلف مکاتب و مذاہب کے متعلق ہے۔

اس کے بعد جود وسخا، گرسنگی، مشاہدہ، صحبت، آداب صحبت، آداب سفر، کھانے پینے، چلنے پھرنے کے آداب، سفر وحضر میں سونے جاگنے کے آداب، گفتگو اور خاموشی کے آداب، نکاح و تجرد، اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر مشتمل انتالیس باب اس کتاب کے موضوعات رہے ہیں جن میں آخری اور اہم باب سماع اور آداب سماع سے متعلق ہے۔

یہ تمام موضوعات ضمنی طور پر کتاب میں شامل ہوتے گئے ہیں لیکن اصل تو کشف کے متعلق ہے۔ اس ضمن میں حضرت نے گیارہ موضوعات منتخب کیے ہیں اور ہر موضوع کو ایک کشف کا نام دیا ہے جو ایک باب کی شکل میں مفصل طور پر مذکور ہے۔ کتاب کا پہلا باب یعنی کشف حجاب اول معرفت الٰہی کے عنوان سے ہے جس میں معرفت کے نظریاتی اختلافات اور اس سے متعلق رموز و لطائف کا بیان ہے۔ ایک حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگر تمہیں اللہ تعالی کی معرفت کما حقہ حاصل ہوتی تو تم دریاؤں پر خشک قدم چلتے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔''

دوسرا کشف توحید کے بیان میں ہے۔ تیسرا کشف حجاب ایمان کے بارے میں ہے۔

ایمان کی علامتوں میں یہ ہے کہ بندہ دل سے توحید کا اعتقاد رکھے، آنکھوں کو برائیوں سے بچائے، اللہ کی نشانیوں اور آیتوں سے عبرت لے، کانوں سے کلام الٰہی کی سماعت کرے، کھانے پینے میں حرام چیزوں سے گریز کرے۔ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کرے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے محفوظ رکھے یہ تمام ایمان کی علامات ہیں لہذا تمام اہل

ایمان کو اس پر اتفاق کرنا چاہیے۔

چوتھا کشف نجاست سے پاکی اور طہارت کے متعلق ہے جس کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔

نماز کا بیان پانچواں کشف ہے۔ زکوٰۃ چھٹا کشف ہے اس باب میں زکوٰۃ کے تلازمات کو بڑی تفصیل سے آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ روزہ ساتواں کشف۔ آٹھواں حج کے بیان میں ہے۔ نواں کشف صحبت اور اس کے آداب و احکام سے متعلق ہے۔ ادب کی تین قسمیں بیان کی ہیں اول وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ ملحوظ رکھتا ہے۔ دوسری قسم کا تعلق معاملات سے ہے یعنی کسی حال میں ہوں ہمیشہ مروت کا لحاظ رکھنا تیسری قسم لوگوں کے ساتھ صحبت میں حسن معاملہ ہو۔

کتاب کا دسواں کشف حجاب مشائخ کے کلام اور ان کے الفاظ و معانی کے بیان میں ہے۔ گیارہواں اور آخری کشف سماع سے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں:

تمام سنی جانے والی باتوں میں سب سے زیادہ اہم، دل کے لئے مفید ظاہر و باطن کے لئے باعث ترقی اور کانوں کے لئے لذیذ اللہ کا کلام ہے اور تمام اہل ایمان کو اس کے سننے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ طبیعت اس کے سننے اور پڑھنے سے بے چین نہیں ہوتی کیونکہ اس میں رقت بہت زیادہ موجود ہے۔ حتی کہ کفار قریش راتوں کو چھپ کر حضور اکرمؐ کی نماز میں قرائت و تلاوت کو شوق سے سنتے تھے اور قرآن کے اس معجزہ یعنی اس کی لطافت و رقت پر حیران رہ جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں سید ہجویری نے بے شمار روایات و حکایات بیان فرمائی ہیں۔

قرآن پاک کے بعد سماع کے ضمن میں دوسرا موضوع اشعار سننے کے سلسلہ میں موضوع بحث ہے۔ کہتے ہیں کہ شعر سننا مباح ہے۔ سماع سے متعلق صوفیہ اور مشائخ کے اقوال بھی کتاب میں شامل ہیں لیکن اختصار کے ساتھ۔ کہیں کہیں اختلاف کا بھی ذکر کیا گیا

ہے۔ اور اس سلسلے میں صوفیہ کے مراتب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ سید ہجویری نے سماع کے آداب بھی بیان کیے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب تک ضرورت نہ ہو سماع نہ کرے۔ اسی کو عادت نہ بنائے لیکن کبھی کبھی سماع کرے۔

زیرِ نظر کتاب کا اختتام حسب ذیل عبارت کے ساتھ ہوتا ہے:

> ''کشف المحجوب پر کوئی تبصرہ تو در کنار اس کے تعارف کے لئے بھی یہ مختصر سی تصنیف کافی نہیں ہے۔ کشف المحجوب کے جو حوالے اور اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان کا مقصد صرف اس بیان پر اصرار ہے کہ شیخ ہجویری کی اس تصنیف میں وہ تمام عناصر اور خواص موجود ہیں جو درسیات کی موجودہ اصطلاح میں اس کو تصوف کا ایک مکمل نصاب بلکہ اولین نصاب قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔ اللہ رب العزت سے اس دعا کے ساتھ یہ تحریر اختتام کو پہونچتی ہے کہ اس کو شرف مقبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔''

اس مضمون میں مجھے اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل روحانی بصیرتوں سے بھرپور زیرنظر تصنیف سے اقتباسات پیش کر دینا ہی مناسب معلوم ہوا۔ اس کتاب کے آخری پیراگراف کے ساتھ اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

◈◈◈

ابتدائی اردو گرامر

نام کتاب : ابتدائی اردو گرامر

مصنفہ : شگفتہ خاتون

تبصرہ نگار : ڈاکٹر زہرہ فاروقی

بچوں کے لیے کتابیں لکھنا سننے میں معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ بچوں کی ذہنی سطح تک اترنا، ان کی پسند ناپسند کو سمجھنا کسی مصنف اور اس کی تصنیف کی کامیابی کے لیے بنیادی شرطیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں کیفیات ہمیشہ یکساں نہیں ہوا کرتیں وقت اور زمانے کی ترقیات اور ماحول کے اعتبار سے ہر عمر کے بچوں کی سوچ اور ذہنی سطح بدلتی رہتی ہے، اس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اب بچے سند باد جہازی کی کہانیوں اور عمرو عیار کے کرتبوں سے خوش اور مطمئن ہونے والے نہیں، اب وہ سائنس اور کمپیوٹر کے کرشموں کو دیکھنا، سننا اور جاننا چاہتے ہیں۔ بات اگر نصابی کتابوں کی ہو تو یہ کام قدرے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں بچوں کی مذکورہ بالا ذہنی صلاحیتوں اور انھی کے مطابق ان کی ضرورتوں کے علاوہ اسکول کے ذمہ داروں کی رائے اور ان کے فیصلوں کو بھی خاص دخل ہوتا ہے۔ تعلیمی مضامین میں تنوع اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، تدریس کے طریقے بدلتے

جارہے ہیں، زبان اور ذریعہ تعلیم بدلتے جارہے ہیں۔ ان سب کا لحاظ رکھنا واقعی ایک دشوار گزار کام ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''ابتدائی اردو گرامر'' انہی مشکلوں کے درمیان سے ایک راہ نکالنے کی کوشش ہے۔ یو پی پروجیکٹ اسکول، اوکھلا نے جب اپنی ابتدائی جماعت میں اردو کو بطور ایک نصابی مضمون شامل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی محرک ٹیچر شگفتہ خاتون کو چار کلاسوں میں اردو پڑھانے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اس سلسلے میں انھیں جو تجربات ہوئے انہی کی روشنی میں انھیں ایک آسان ابتدائی اردو گرامر کی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کی تکمیل اور اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے انھوں نے خود ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اب اہلِ نظر کو اس کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہے اور جن اسکولوں کے ذمہ دار حضرات اس کو ضرورت کے مطابق سمجھیں وہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب میں ابتدائی گرامر اور مشقوں کے علاوہ اردو میں ضروری درخواستیں اور خطوط لکھنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں اور اردو مضمون نگاری سے دلچسپی پیدا کرنے اور اس سمت میں بچوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کو ایک اور زاویہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اردو کو نئے اسکولوں یعنی علاقوں میں متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ زبان کے ابتدائی اصولوں سے بچوں کو آگاہ کرنے اور زبان کے لطیف نکتوں سے روشناس کرانے اور اس سے دلچسپی بڑھانے کی کوشش ہے۔ اس اعتبار سے اس طرح کی کوششوں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے۔ والدین اردو کی تعلیم میں رہنمائی کرنے والی کتابوں کی خریداری کے ذریعے دیگر مصنفوں اور آئندہ تصنیفات کی حوصلہ افزائی میں معاون ہو سکتے ہیں۔

◈◈◈

مولانا اظہر غوری کی تصنیفات

ترجمہ بغایت کردی اظہر ‏ در فن نہایت کردی اظہر
کردی آساں بہ اردو گویاں ‏ ایں ہم عنایت کردی اظہر

مولانا اظہر ندوی کی کوئی ایک درجن تصنیفات نظم و نثر میں دو خواص غالب ہیں ایک تو وہی ترجمہ ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا دوسرے مقصدیت ہے۔ گو ان کے تراجم اسی مقصدیت کے تابع ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے میں ایسے مدغم ہیں کہ اس تحتی کیفیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ تراجم بذات خود آزادانہ تصنیف معلوم ہوتے ہیں جو کہ ترجمے کی خوبی ہے۔ اگر مولانا اظہر کی تصنیف یا ترجمہ ''شاہراہِ اعتدال'' مطبوعہ ۱۹۹۵ء سے لے کر مولانا آزاد کے ''ترجمان القرآن'' کی تلخیص و ترجمہ تک ساری کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تاثر راسخ ہو جاتا ہے کہ سب کا ایک واحد مقصد ہے اور وہ مقصد ہر جگہ نہ صرف جاری و ساری ہے بلکہ پوری طرح حاوی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مقصد خود مولانا اظہر کی روح میں سرایت ہے۔ لہٰذا وہ جب بھی لب کشائی کرتے ہیں، اسی ایک مقصد کی صدا سنائی دیتی ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ وہ مقصد ہے دینِ اسلام کی تبلیغ اور اس کے روشن چہرے سے ہر کہہ و مہہ، ہر کس و ناکس کو ایسی زبان میں روشناس کرانا جسے وہ سمجھ سکے۔ ہمارے شہرۂ آفاق

مدارس کے لائقِ صد احترام اکابر اور فارغین نے اسی مقصد کو حرزِ جان بنایا اور اسی مشعلِ راہ کو لیے منازل بحر و بر کو طے کرتے رہے۔

مولانا اظہر کی تصنیفات کے حوالے سے اسی مقصد کی بات کی جائے تو دیکھیں گے کہ حافظ ابن رجب کی تصنیف ''جامع العلوم والحکم'' کا ترجمہ بعنوان جامع احادیث ''گنجینۂ حکمت'' مطبوعہ ۱۹۹۷ء کی تمہید میں مولانا فرماتے ہیں: ''پچاس جامع حدیثوں کی تشریح وتوضیح پیش کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اسے پڑھ کر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر رسول اللہ ﷺ کی روشن ہدایات معلوم ہو جائیں اور آپ کی دکھائی ہوئی سیدھی اور سچی راہ واضح ہو جائے۔''

شاہراہِ اعتدال

''شاہراہِ اعتدال'' کی تمہید میں فرماتے ہیں ''آج ملت کو سب سے زیادہ ضرورت فکری ہم آہنگی کی ہے اور اس کے لیے وسعت نظری، حق پرستی، رواداری اور دوسروں کی قدر شناسی اور ان کے ساتھ انصاف ناگزیر ہے...... زیرِ نظر کتاب میں انہی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، جن سے ملت کے افراد کے درمیان فکری یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔'' ملی امراض اور ان کا علاج'' کے زیرِ عنوان کتاب کے مقدمے میں علامہ غزالی کے خیالات کے ساتھ چند مقامی اہمیت کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

''اسلام یہ ہے'' مطبوعہ ۱۹۹۸ء علامہ محمد غزالی کی تصنیف ''**ھذا دیننا**'' کا ترجمہ ہے۔ اس تصنیف کے آغاز میں ''عرضِ مترجم'' کے زیرِ عنوان مولانا اظہر رقم طراز ہیں ''علامہ غزالی دعوت وتصنیف کے میدان میں تقریباً نصف صدی سے سرگرم عمل ہیں اور انھوں نے گہرائی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلق پائی جانے والی بے بنیاد خام خیالیوں اور غلط فہمیوں کا پوری بیدار مغزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں اسی مطالعہ کا نچوڑ مختصر مگر جامع و واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ان تراجم کے علاوہ ان شعری مجموعوں کے عنوانات پر، جنھیں ہم اوریجنل تصنیفات کہہ سکتے ہیں، نظر ڈالیں تو وہی ذہنی فضا کارفرما نظر آتی ہے جس پر مقصدیت کا غلبہ ہے اور وہ مقصد اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی مقصد اور ترجمے کا امتزاج ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم اور گڈ مڈ نظر آتے ہیں۔ مثلاً: ''حرف حرف گلاب'' مطبوعہ ۲۰۰۵ء ایک شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ''تقدیم'' کے زیرِ عنوان علامہ ابوالمجاہد زاہدؔ لکھتے ہیں ''حرف حرف گلاب ان کا پانچواں مجموعہ کلام ہے جو حمدوں، نعتوں، منقبتوں اور دعاؤں کے لیے مخصوص ہے۔ یہ نظمیں نہ صرف صداقت و واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہیں، بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی جاندار اور شاندار ہیں۔'' ''مضراب'' مطبوعہ ۱۹۹۸ء کے مشمولات ہیں: حمد، نعت، منقبت، ابن فرضی اندلسی کی ''ذات حمد باری''، امام سہیلی کی دعائیں (عربی سے ترجمہ)۔ کتاب کے آخری حصے کا عنوان ہے ''جن ہستیوں کی اپنے دلوں میں ہیں بستیاں'' اس میں ان عظیم ہستیوں کو خراجِ عقیدت ہے، جن کی روشن دماغی نے ملک کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کا نام بھی روشن کیا ہے اور جن کے علمی، سماجی اور سیاسی کارنامے مسلمانوں کی سربلندی کا باعث بنے ہیں۔ ان محترم ہستیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید قطب شہید، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا سلمان ندوی، مولانا علی میاں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ترجمان القرآن کی تلخیص

مولانا آزادؔ سے مولانا اظہر کا روحانی اور قلبی لگاؤ انھیں کشاں کشاں ترجمان القرآن تک لے جاتا ہے، جہاں ترجمہ میں مقصد کا راز جو ان کے تحت الشعور میں تھا، منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے اور مولانا آزاد کی وہ بصیرت ان پر منکشف ہوتی ہے، جسے خود مولانا کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ ''ترجمان القرآن کا مقصد و نوعیت'' بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قرآن کے درس و مطالعے کی تین مختلف ضرورتیں ہیں اور میں نے انھیں تین کتابوں میں منقسم کردیا ہے: متن وتفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن...... ترجمان القرآن قرآن کی عالمگیر تعلیم واشاعت کے لیے...... (یہ) سب سے پہلے شائع کی جاتی ہے کیونکہ اپنے مقصد ونوعیت میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے اور فی الحقیقت تفسیر و مقدمے کے لیے بھی اصلی بنیاد یہی ہے۔''

''اس کی ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہوجائے جس میں کتبِ تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن کوٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے امید ہے کہ اہلِ نظر اس کی موزونیت بیک نظر محسوس کریں گے۔ پہلی کوشش کی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہوجائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے۔...... کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر ونظر کا موضوع رہا ہے۔''

لگتا ہے کہ مولانا اظہر جب ترجمان القرآن کی تلخیص سے فارغ ہوئے تو پھر مولانا آزاد کے پیدا کردہ صحرائے سحر البیان میں گم ہوگئے اور اسی عالم گم گشتی میں عالم عرب وعجم کی خاک چھانتے ہوئے چمنستانِ فارسی کی ہوائے جانفزا میں سانس لیتے رہے جہاں شیراز واصفہان وروم کی روحانیت پہلے ہی سے حل تھی، وہ مولانا اظہر کے وجود میں سرایت کرگئی پھر ان کی قوت نمو سے توانائی پاکر ایک تصنیف کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

لعل و گہر

''لعل و گہر'' ایک خاص جدت کی حامل ہے اور تراجم کی رہِ عام سے مختلف ہے۔ مولانا آزاد اپنی تحریروں میں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار بے تکلّفانہ استعمال کرتے چلے گئے ہیں۔ مولانا اظہر ندوی نے ان تحریروں میں شامل عربی و فارسی اشعار کو یکجا کرکے نہ صرف اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے بلکہ منظوم ترجمہ کیا ہے تا کہ اصل تحریر سے ان کا میل

برقرار رہے۔ بات اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بھی ہے۔ ہمارے مدرسوں اور اسکولوں میں جو فارسی داخلِ نصاب ہے وہ عام طور سے ابتدائی یا اوسط درجے کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔اس کا اصل مقصد بزرگوں کے کلام کے ذریعے اخلاقی تعلیم دینا ہے۔اس لیے ان کے کلام کے انتخاب میں عموماً یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ آسان ہوں کہ ان کی تفہیم میں سہولت ہو۔ لیکن مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں جن فارسی اشعار کو شامل کیا ہے، ان کے معاملے میں اس طرح کے تدریسی ملحوظات نہیں ہیں، بلکہ انھیں تو مولانا اپنی تحریر کے ترنگ میں لکھتے چلے گئے ہیں، اس لیے مولانا کی تحریروں سے ان کا میل کھانا، ان کی فکر کی ترجمانی کرنا اور موقع محل سے مطابقت رکھنا ضروری ہوگا۔

جہاں تک مولانا کی تحریروں کے خواص کا تعلق ہے وہ اظہر من الشّمس ہیں۔ ان کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ان کی عام تحریروں کی تفہیم کے لیے بھی علمی اعتبار سے خاصے ذہنی بلوغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی صحافتی تحریریں بھی اسی زمرے میں شامل ہیں، تو پھر مولانا کی ان تحریروں کے مدارج کا قیاس کیا جاسکتا ہے، جو انھوں نے علمی یا ادبی محرکات، ملحوظات یا ضرورتوں کے تحت لکھی ہوں گی۔ اس گفتگو کا مقصد اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ مولانا نے جن فارسی اشعار کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہوگا وہ بھی اسی درجہ اور پایہ کے ہوں گے۔ فارسی ادب کی دنیا کیسے کیسے نابغہ روزگار شعراء اور انشاء پردازوں کے آثار سے تاباں اور درخشاں ہے اس کے ذکر کا بھی یہ موقع و محل نہیں ہے۔ حوالے کے لیے ہمارے یہاں صرف بیدلؔ اور غالبؔ کافی ہیں۔ وہ شبلیؔ کو ہندوستان میں فارسی کا آخری شاعر مانتے ہیں۔ ایسے میں مولانا آزاد کے استعمال کیے ہوئے فارسی اشعار کا ترجمہ وہ بھی منظوم ترجمہ کرنے کے حوصلے کو قابلِ داد کہنا کافی نہیں ہے۔ اس کو تو بہتیرے حوصلہ مندوں کے حوصلوں کی آزمائش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا اظہر ندوی کی اس کاوش کی ستائش کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ ان کی یہ تصنیفی کاوش اربابِ علم و ادب کے لیے ایک ادبی تلذذ کا سامان فراہم کرتی ہے۔

مولانا آزاد کی تحریروں کی ایک معجزاتی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا کے علمی تبحر اور عالمانہ وزن و وقار کے باوجود ان کی تحریروں میں زاہدانہ یبوست اور بے رنگی یا واعظانہ خشونت نہیں ہوتی۔ پڑھنے والے کو ایک ایسی فرحت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے جو اس کو تحریر کے ساتھ کشاں کشاں لیے جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک سنجیدہ قسم کی بزلہ سنجی ہوتی ہے، چنانچہ فارسی اشعار کے انتخاب میں بھی اسی طرزِ فکر اور افتادِ طبع کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری میں بنتِ عنب کے گوناگوں پہلوؤں اور واعظ و محتسب سے ہلکی پھلکی آویزشوں کی چاشنی ملتی ہے۔ مولانا بھی ان کوائف سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس حظ میں قاری کو بھی شریک کرتے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال حافظؔ کا یہ شعر ہے:

محتسب خم شکست و بندہ سرش السنِ بالسنِ و الجروح قصاص

محتسب نے خم توڑا تو ہم نے سر اس کا دانت کا دانت ہی تو ہوگا قصاص

اس وقت دو ملحوظات پیش نظر ہیں ایک تو یہ کہ مولانا آزاد نے اپنی مختلف تصنیفات میں جو ہزاروں فارسی اشعار استعمال کیے ہیں، ان کے تنوعات کے ذریعہ مولانا کے ذوق اور ان کے فکری کینوس کی بے پناہ وسعتوں کا ذکر کیا جائے تا کہ قاری کو اس مختصر حوالے سے ان کی تحریروں اور تصنیفوں کو پڑھنے کی ترغیب ہو جس کا چسکا ایک بار لگ جانے کے بعد چھوٹنے کا نہیں۔ ساہتیہ اکاڈیمی نے مولانا کی تصنیفات کو شائع کر کے اور نسبتاً کم قیمتوں پر فراہم کر کے اصحابِ ذوق کے لیے بڑی آسانی کر دی ہے۔

دوسری جو بات فی الحال پیش نظر ہے وہ مولانا کے محولہ فارسی اشعار کا وہ ترجمہ ہے جو مولانا اظہر ندوی نے اردو میں کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ترجمے منظوم ہیں، فارسی نثر کا اردو نثر میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے کیونکہ بیشمار فارسی الفاظ اور اصطلاحات بھی اردو زبان کا حصہ ہیں۔ لیکن آج بدلتے ہوئے تہذیبی پس منظر میں یہ صورتِ حال یقیناً بدلتی جارہی ہے، یہ کیفیت ایک طرح سے زبان کی پامالی کے مترادف ہے جس سے اہلِ

زبان فکر مند اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ بہر حال اشعار کا منظوم ترجمہ یقیناً مشکل ہے۔ زبان کے علاوہ شاعری کے اپنے مضمرات، محاسن اور فنی تقاضے ہوتے ہیں، ان سب کو ترجمے میں سمونا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم قاری اس ترجمہ کے ذریعے شاعر کی بنیادی فکر کے قریب تو پہنچ ہی جاتا ہے۔ یہ قربت جتنی زیادہ ہوگی ترجمہ اتنا ہی کامیاب تصور کیا جائے گا۔

اتنے سارے پہلوؤں کو مثالوں کے ذریعہ پیش کرنا ہو تو مثالوں کی تلاش اور انتخاب کا مسئلہ تو ایک طرف رہا، کسی مضمون میں ان کا احاطہ کرنا اور ان کے لیے گنجائش نکالنا شاید ناممکن ہوگا بہر حال مجموعی صورت حال کی کچھ چاشنی پیش کرنے کی ذیل میں کوشش کی جارہی ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں جن فارسی اشعار کو استعمال کیا ہے انھیں اکٹھا کر کے اردو میں ان کا ترجمہ کرنے کا جب مولانا اظہر کو خیال آیا ہوگا تو ان اشعار کو مولانا آزاد کی مختلف تصنیفات اور تحریروں میں تلاش کر کے یکجا کرنے کی بنیادی مشقت کے بعد یہ مشکل سوال بھی ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ ان کو پیش کرنے کے لیے کون سی ترتیب اختیار کی جائے۔ وہ ترتیب کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ تصنیفات کو ایک ایک کر کے لیا جاسکتا تھا، پھر متفرق تحریروں کو جوڑا جاسکتا تھا۔ ایک اور صورت موضوعات کی بھی ہوسکتی تھی کہ موضوعات کو درج کر کے ان کے ذیل میں اشعار درج کیے جائیں جو بہت دلچسپ ترتیب تو ہوتی لیکن موضوعات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر کام کو گنجلک کر دیتے۔ ایک ترتیب ان شعرا کے اعتبار سے بھی ہوسکتی تھی جن کے اشعار استعمال کیے گئے ہیں اور کثرت استعمال کے لحاظ سے ان کی تقدیم و تاخیر کی ترتیب رکھی گئی ہوتی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مولانا اظہر نے ترتیب ابجد کو اختیار کیا یہ بڑا دانشمندانہ اور سائنٹفک طریقہ بھی ہے۔ بس ایک ذرا سی کمی کی خلش محسوس ہوتی ہے۔ اگر شاعر کا نام بھی ہر شعر کے قریب آگے پیچھے کہیں دے دیا گیا ہوتا تو لطف بڑھ جاتا اور اس کتاب کی افادیت بھی بڑھ جاتی۔ جناب مالک رام نے اس راہ

میں اوراس کام میں بڑی مدد کردی ہے۔مولانا آزاد کی تصنیفات ''تذکرہ'' اور''غبارِ خاطر'' کے آخر میں انھوں نے حواشی کا اضافہ کیا ہے، جو بڑی محنت اور کاوش کا متقاضی علمی کام ہے۔ غالباً سب سے زیادہ فارسی اشعار''غبارِ خاطر'' میں ہی یکجا ملیں گے۔اس تصنیف کی ایک خصوصیت اورخوبی یہ ہے کہ اس میں شامل خطوط ایک آزادانہ ذہنی فضا میں کسی واقعی یا مفروض دوست کو لکھے گئے ہیں، اس لیے مولانا آزاد کی فکراورطبع آزاد کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس سے مولانا کی کثیر پہلو شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔جیسا کہ کچھ پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ ان کی تحریروں میں سنجیدگی اور بذلہ سنجی کا نہایت پرلطف امتزاج ہے۔وہ رجحان ان کے محولہ اشعار میں بھی کارفرما ہے۔مولانا اظہر نے اردو ترجمہ میں بھی اصل سے انتہائی حد تک ممکن قربت کوملحوظ رکھا ہے لیکن پھر بھی ترجمہ تو ترجمہ ہے گو ترجمہ بغایت بھی ہے۔

۱۴۳۰ھ

محض چند اشعار کے ترجمے پیش کرتا ہوں اور قاری کو کیف ومستی،فن کے لطف و تلذذ کی سرشاری کے عالم میں چھوڑ کر رخصت چاہتا ہوں۔

تا تازہ و تر زنم رقم را در بادہ کشیدہ ام قلم را
تاکہ جو کچھ بھی لکھوں وہ تروتازہ لکھوں ساغر مے میں قلم اپنا ڈبودیا میں نے

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا
کلی کی پاکیِ داماں سے دل لرزتا ہے کہ بلبلیں تو ہیں سب مست باغباں تنہا

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ ہرچہ ساقی ماریخت عین الطاف است
کرنوش،مت یہ دیکھ وہ صافی ہے کہ تلچھٹ ساقی سے جو مل جائے وہ ہے عین عنایت

مے حاجت نیست مستیم را — در چشم تو خمار باقیست
میری مستی کو ضرورت نہیں ہرگز مے کی — جبکہ آنکھوں میں خمار اب بھی تری باقی ہے

روئے نکو معالجۂ عمر کو تہ ست — ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ اند
عمرِ کوتاہ کا ہے بسِ رخِ روشن ہی علاج — ہم کو بتلاگئی نسخہ یہ مسیحا کی بیاض

زدستِ شاہد سیمیں عذار عیسیٰ دم — شراب نوش و رہا کن حدیثِ عاد و ثمود
اٹھالے شاہدِ عیسیٰ نفس کے ہاتھ سے جام — پڑھا کے بھول بھی جا سب حدیثِ عاد و ثمود

خرقہ را زُنار کردست و کند — عشق ازیں بسیار کہ دست و کند
زنار بنا ڈالے ہے یہ خرقۂ زاہد — کر سکتا ہے یہ عشق کچھ اس سے بھی سوا

نہ دانم تا چہ برقِ فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم — تصور کردہ ام بگسستن بندِ نقابش را
کیا برق فتنہ ٹوٹ پڑی ہوش پر مرے — بندِ نقاب اس کا کھلا تھا خیال میں

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست — اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را
حور و جنت جلوہ فرما ہیں راہِ یار میں — دھیرے دھیرے راہ پر لاتا ہے بیگانے کو عشق

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا
ہے ہجر اور وصال کی لذت الگ الگ — سو بار جاؤ، شوق سے آؤ ہزار بار

دماغ برفلک و دل بپائے مہرِ بتاں — چگونہ حرف زنم، دل کجا، دماغ کجا
پائے صنم یہ دل ہے دماغ آسمان پر — اب کیا کہوں، کہاں ہے دماغ اور دل کہاں

(نئی دہلی، ۲۹؍جنوری ۲۰۰۹ء)

◈◈◈

سخنورانِ اعظم گڑھ

نام کتاب : سخنورانِ اعظم گڑھ
مصنف : قمر الزماں مبارکپوری

''اردو کی اصل اودھی زبان ہے اور خطۂ اودھ اس کا مولد ومہد ہے۔ اعظم گڑھ اس خطۂ اودھ میں شامل ہے۔ اردو ہندی سے زیادہ قدیم ہے اور ہندی اردو کی ایک شیلی ہے۔'' بہتیرے تاریخی شواہد اور مستند مورخینِ ادب اردو کی تصنیفات کے حوالوں سے قمر الزماں مبارکپوری نے اپنے ان نظریات کی تصدیق کی کوشش کی ہے۔

''سخنورانِ اعظم گڑھ'' کے زیرِ عنوان ایک ضخیم قاموس کی پہلی جلد شائع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب بظاہر تو اعظم گڑھ اور اس کے اطراف و دیار کے قصبات کے شعراء کا تذکرہ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عنوان کے تحت اعظم گڑھ کے آغاز، ارتقا، تاریخ و جغرافیہ، معاشرت بلکہ مختلف معاشرتوں کے امتزاج، ان کے تشکیلی عناصر کی جملہ تفصیلات یکجا کردی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف، مؤلف یا بقول خود مرتب قمر الزماں مبارکپوری بذاتِ خود جسمانی معذوریوں کا شکار اور کرسی نشین ہیں، لیکن اعظم گڑھ کے متعلق اقبال سہیل کے قول فیصل ''جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِ اعظم ہوتا ہے'' کی تعبیر و تفسیر مرتب کرنے

میں عزم مصمم کے ساتھ ہمہ تن مصروف ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کی چھ جلدوں کے لیے مواد اکٹھا کیا جا چکا ہے لیکن ابھی پہلی ہی جلد شائع ہوئی ہے، دوسری جلد عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کے بعد اس علاقے کے عربی اور فارسی شعراء کے متعلق بھی دو جلدیں شائع کرنے والے ہیں۔ (افسوس صد افسوس کہ وقت نے انھیں مہلت نہیں دی۔ میری کتاب ''اوراقِ ہستی'' ان کو مل گئی تھی اس کو دیکھنے کے بعد مارچ ۲۰۲۱ء میں انھوں نے فون کر کے اس کتاب کی بڑی تعریف کی اس کے بعد جلد ہی غالباً مختصر علالت کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں)

جغرافیہ:

''صوبہ اتر پردیش کا مشہور شہر ضلع اعظم گڑھ گومتی اور گھا گھرا ندیوں کے درمیانی حصہ میں واقع ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ٹونس (تمسا) ندی بہتی ہے۔ یہ علاقہ زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ جاڑا، گرمی، برسات تینوں موسم اس سرزمین کو متاثر کرتے ہیں۔''

معاشرت:

''اعظم گڑھ اس معنی میں بھی اپنی الگ شان رکھتا ہے کہ اس کی آغوش میں ایک قوم، ایک نسل اور ایک ہی رنگ و علاقہ کے لوگ نہیں پلتے، اور نہ ہی یہاں کے باشندے ایک مذہب کے پیروکار ہیں اور نہ ہی ایک زبان بولتے اور لکھتے ہیں۔ یہ ضلع ایک مختصر خطۂ ارضی ہونے کے باوجود اپنے گوناگوں تمدنی منظر ناموں کے حوالے سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش اور حریف تمکین و ہوش ہے۔ یہ اپنے تنوع، نسلی اختلافات، مذہب وعقیدت، رسم ورواج، صناعی وطباعی، سیاست وتجارت اور کثیر رنگی تمدنی اقدار کے مثبت امتزاج کے اعتبار سے براعظم ایشیا کی رنگا رنگی کا دلکش نمونہ ہے۔ یہاں کے لوگ بعض امور و معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں پھر بھی اپنی حقیقت میں ایک قوم ہیں۔ یہاں کی انیکتا

میں ایکتا کی جودت ہے۔''

کتاب کے شروع میں انتساب، شعراء کی فہرست اور اظہارِ تشکر وغیرہ بارہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مقدمہ شروع ہوتا ہے جو بارہ کم ایک سو صفحات پر محیط ہے۔ اسی مضمون میں اعظم گڑھ کی تاریخ، جغرافیہ، شروع سے اب تک آباد اقوام کے لسانی، معاشی اور معاشرتی خواص، ان کے طور طریقے، رسم و رواج وغیرہ مذکورہ ہیں لیکن اس مضمون کے زیادہ حصے میں یہ ثابت کرنے پر زور دیا گیا ہے کہ اردو زبان کی جائے پیدائش نہ دکن ہے نہ پنجاب، نہ یہ عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کا ملغوبہ ہے، نہ اس کی اساس کھڑی بولی ہے، غرض یہ کہ اردو زبان کی ابتدا و ارتقاء کے متعلق اب تک کے سارے نظریات و مفروضات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے اردو زبان کی جائے پیدائش خطۂ اودھ کو اور اس کی اساس اودھی زبان کو قرار دیتے ہیں۔ قمر الزماں مبارکپوری اپنے اس دعویٰ کی تائید میں تاریخی شواہد اور مستند مصنفین کی تصنیفات کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ مزید براں ان بزرگوں کی ایک لمبی فہرست پیش کرتے ہیں جن کے مواعظ عربی یا فارسی زبان میں نہیں بلکہ مقامی زبان یعنی اودھی میں ہوا کرتے تھے، بہ الفاظ دیگر وہ اودھی زبان کی تبلیغ و تشہیر میں ایک بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح مختلف زمانوں میں حکمراں بھی رعایا کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

انھیں افسوس ہے کہ اردو زبان سیاسی تعصب کا شکار ہوئی۔ انھیں اپنی معذوری کا بھی دکھ ہے کہ اطراف و دیار کا اچھی طرح سفر کر کے مزید تصنیفی مواد اور تفصیلات نہیں حاصل کر سکے۔ انھوں نے بڑی حد تک ان کتابوں سے استفادہ اور ان پر انحصار کیا ہے جو انھیں دستیاب ہو سکیں۔ جن کی فہرست انھوں نے مقدمہ کے آخر میں دی ہے۔ ان کی تعداد ۱۳۸ ہے۔ اس کے بعد ان شعراء کے تذکرے ہیں جن کی تعداد ۱۳۳ ہے۔ انھوں نے شاعروں کو بہ لحاظ ابجد ترتیب دیا ہے نہ کہ بہ لحاظ زمانہ۔ چنانچہ اس پہلی جلد میں صرف انہی شعراء کے

نام شامل ہیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں۔ انھیں افسوس ہے کہ دست بردزمانہ، تقسیم وطن کی مار اور نئی نسلوں کی اردو سے ناواقفیت اور اسلاف کی تحریروں کے تحفظ کی ضرورت کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے بہت سارا مواد ضائع ہوگیا۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ ہے کہ
''اس کتاب میں جتنے شاعروں کا تذکرہ آیا ہے وہ کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں مل سکتا۔''

قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تصنیفات میں علمائے اعظم گڑھ کے تذکرے اکٹھا اور مرتب کرکے زمانے کی بے رحمی اور گمنامی سے بچا کر انھیں زندہ جاوید کردیا۔ اب یہی کارِ خیر سخنورانِ اعظم گڑھ کے متعلق ایک اور بزرگ قمر الزماں مبارکپوری نے شروع کیا ہے۔ پہلی ہی جلد پانچ سو صفحات اور صرف الف سے شروع ہونے والے ناموں کے شعرا پر مشتمل ہے۔ ''قیاس کن زخزانِ سن بہار مرا۔'' آغاز تصنیف ہی میں اعظم گڑھ کی عظمتوں کے ترانے ہیں اس لیے عین مناسب ہے کہ وہ اعظم گڑھ کی عبقری شخصیات کا تذکرہ عالمی شہرت رکھنے والے سائنسدانوں پروفیسر اسرار احمد، ڈاکٹر طارق، شمیم جیراجپوری وغیرہ کے ناموں سے شروع کرتے ہیں اور بے تحاشا بڑھتے جاتے ہیں اور علم وادب کی دنیا کو تابانی عطا کرنے والی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا شبلی نعمانی جیسی شخصیات کا ذکر کرتے ہیں تو بے تابانہ بڑھے چلے جاتے ہیں اور ان درجنوں مشاہیر کے نام پیش کرتے ہیں جو ان مذکورہ بالا شخصیات سے متاثر ہوئیں۔ ان کی تحقیق وتجسس اور شدت اظہار کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔ اقتباسات کچھ زیادہ ضرور ہیں لیکن ان کے بغیر مصنف کے دلائل کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ کم سے کم کرنے کی کوشش کے باوجود اقتباسات بہت کافی ہوگئے ہیں، کتاب کی کمیابی کے پیش نظر شاید یہ مناسب بھی ہو۔

''یہ ضلع چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل ہے لیکن یہ دیہقانی علاقے بھی اپنے سینے میں گنج ہائے گرانمایہ چھپائے ہوئے ہیں۔ بغداد، بصرہ، مصر وحجاز، یونان وروما، شیراز و اصفہان، سمرقند و بخارا کے علوم کی دولت اس دیار کے علمی اور فنی تمول کا سبب ہے۔''

''حقیقت میں اربابِ قلم کے تاثرات کا اجمال واختصار یہ ہے کہ اعظم گڑھ ایک ایسا گہوارۂ علم و دانش ہے اور دیارِ شعر ونغمہ ہے جس کی آغوش میں عظیم دانشور، مفکر، موجد، انجینئر، سائنسداں، صاحبِ تدبیر و فراست، عیانِ حکومت و دولت، ماہرین سیاست و ریاست، موسیقار، گلوکار، رقاص، مصور، معمار، مجسمہ ساز، ظروف گر، صناع، پارچہ باف، نباض، حاذق طبیب، ڈاکٹر، سرجن، ادیب، شاعر، صحافی، تنقید نگار، پروفیسر، ماہرین ریاضیات ولسانیات، اولیا، علما، صوفیہ، مدرس، معلم، خطیب، مترجم، حاشیہ نگار، غرض کہ علم و فن کی تمام شاخوں کونہال کرنے اور ثمر بار بنانے والوں نے آنکھیں کھولیں اور تواتر کے ساتھ ہر دور میں اہم خدمات انجام دیں اور آج بھی مبدائے فیاض کی فیاضی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔''

''کوئی ملک یہاں کے باشندوں سے خالی نہیں ہے۔ تعلیم و تعلّم کی کارگاہ عہد سازی اور مراحل مردم گری سے آگے جا کر صنعت وتجارت، قانون اور عدالت، سائنس و ٹکنالوجی اور حکومت و سیاست کی بساط پر بھی یہ ضلع اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی، ادارہ، اخبار و رسالہ اور درسگاہِ فکر وخیال اس کی دانشوری سے محروم نہیں، ہر تحریک اس خطے کی فکری اور عملی سرگرمیوں سے نمو پذیر ہوئی ہے۔''

آگے چل کر درجنوں سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی تحریکات کی ایک فہرست رقم کی ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں: ہندوستان کی پہلی اور دوسری جنگ آزادی، بھکتی تحریک، تصوف، سماجی اصلاح کی سرگرمی، اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد، اکبر کے دین الٰہی کا غلغلہ، دینِ الٰہی کی بیخ کنی کے لیے علمائے فحول کی مہم جوئی، جمال افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی، تحریک سرسید، تحریک ندوہ، تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، سبھاش چندر بوس کی انقلابی تحریک، مسلم لیگ تحریک، جمعیۃ العلماء، آریہ سماجی تحریک، گئو رکشا کی تحریک، تحریک مخالفت قادیانیت، تحریک اہلِ حدیث، کمیونسٹ تحریک، جماعت اسلامی، آر

ایس ایس کی تحریک، ترقی پسند تحریک، تحریک جدیدیت، مابعد جدیدیت، تحریک قیام مدارس و مکاتب، تحریک مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک وغیرہ۔ ان سب تحریکات میں یہ ضلع پیش پیش رہا ہے۔

تاریخ:

اعظم گڑھ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''تاریخ کے حوالے اور پرانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پورا علاقہ کسی دور میں جنگلوں سے گھرا ہوا تھا، جہاں سادھو، سنتوں اور سنیاسیوں نے اپنے اپنے طور پر ذکر وعبادت اور دھیان و گیان کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، لوگوں نے اپنے اپنے مٹھ اور آشرم بھی تعمیر کیے تھے اسی لیے اس دیار کے لوگوں کے دلوں اور ان کی معاشرتی زندگی پر آج بھی مذہب کی حکومت اور روحانیت کا غلبہ ہے۔ صوفیوں سنتوں کی تعلیم سے رواداری اور قومی یکجہتی کے جو رجحانات پیدا ہوئے انھوں نے یہاں کی معاش و معیشت اور تمدن و معاشرت کو استحکام بخشا۔''

آگے بہت ساری تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''محمد غوری نے قنوج کے راجہ جے چندر دیو کو مغلوب کیا اور کچھ دنوں بعد اسی کے بیٹے راجہ ہریش چندر کو اس دیار کی زمامِ اقتدار سونپ کر واپس چلا گیا۔ ۱۲۲۶ء میں قنوج پر سلطان شمس الدین التمش کے قبضہ کے بعد یہ علاقہ دہلی حکومت کے زیرنگیں آیا۔ ۱۳۹۴ء میں فیروز شاہ تغلق نے شہر جونپور کی بنا ڈالی اور اپنے بیٹے ظفر کو جونپور کا صوبہ دار مقرر کیا تو اعظم گڑھ اس کے ماتحت ہوگیا۔ ۱۴۷۴ء میں شرقی بادشاہوں کے اقتدار کے خاتمہ تک یہ ضلع جونپور کا حصہ رہا۔ ۱۴۷۴ء میں سلطان بہلول لودی نے جونپور کو دوبارہ دہلی حکومت میں شامل کرلیا۔ لیکن ۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر اس خطے پر قبضہ کرلیا۔ ہمایوں کی شکست کے بعد اکبر کے زمانے تک اس علاقے پر لودھیوں

کا قبضہ رہا۔ پھر اکبر نے علی قلی خاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد ۱۵۹۰ء میں عبدالرحیم خان خاناں کو جونپور کا صوبیدار مقرر کیا۔ آئین اکبری میں اعظم گڑھ کے سبھی پرگنوں کے نام ملتے ہیں، (انھی میں سے ایک پرگنہ کا نام کوڑیا تھا۔ میرا قیاس ہے کہ میرے گاؤں کوئریا پار کا نام اسی پرگنے کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے)۔''

''عہد جانگیری میں ابھیمن سنگھ گوتم جو قنوج کے جاگیردار تھے اور معزز گوتم چھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے آگرہ جا کر مسلمان ہوگئے۔ جہانگیر نے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی اور راجہ نادر دولت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔''

''شہنشاہ ہمایوں کے حدود مملکت میں مانکپور، ضلع الہ آباد کے چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت خواجہ مبارک شاہ متوفی ۹۶۵ھ نے قاسم آباد کے کھنڈر پر مبارکپور کو اپنے نام سے منسوب کیا۔''

''راجہ اعظم خاں بانی اعظم گڑھ اور راجہ عظمت خاں بانی عظمت گڑھ کے مورث اعلیٰ ابھیمان سنگھ گوتم، اسلامی نام راجہ دولت خاں تھے۔ ضلع اعظم گڑھ پر نسلاً بعد نسلاً اسی نومسلم راجپوت خاندان کی حکومت تھی۔ یہ خاندان مغل بادشاہوں کا باج گزار تھا۔ ۱۷۷۲ء میں سعادت علی خاں نواب اودھ کے دور میں اس علاقے کو چھین کر اودھ کی نوابی میں شامل کرلیا گیا۔ ۱۸۰۱ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں آگیا۔ ۱۸۳۲ء میں اس کو ضلع کی حیثیت حاصل ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اعظم گڑھ کا شہر جو اس ضلع کا صدر مقام ہے، اپنے دوسرے قصبات وقریات اور ملحقات ومتعلقات سے کم عمر ہے۔ اس ضلع کی بہت سی آبادیاں اعظم گڑھ شہر سے قدیم الوجود ہیں۔''

''اعظم گڑھ کی آبادی دو طرح کے باشندوں پر مشتمل ہے ایک وہ لوگ جن کے آباء واجداد دوسرے مقامات سے آئے، انھیں میر صاحب یا ملکی کہا جاتا ہے۔ ان کے اجداد کو حکومت وقت کی طرف سے ان کے علم و وجدان، درویشی وفقر کے صفات کی وجہ سے

جاگیریں اور معافیاں ملتی تھیں۔ ان کے گھرانے سماج اور اسلامی معاشرے کے ممتاز خانوادے ہوا کرتے تھے۔ ان کے علم وفضل کی وجہ سے ان کی سماجی حیثیت بلند تھی۔ دوسری ایسی قومیں آباد ہیں جن کے خاندان کی جڑیں اسی زمین میں پیوست ہیں۔ اس آبادی کا بیشتر حصہ پیشہ ور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ساری پیداوار اسی کی محنتوں کا ثمرہ ہوتی ہے مگر وسائل معاش پر اس کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہوتا اس لیے سماجی اور تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں ضلع اعظم گڑھ کے اہم قصبات اور وہاں کی عظیم شخصیات کے تذکرے ہیں۔''

''اردو ادب کی تاریخ اور تذکروں میں اعظم گڑھ اور نواحی اضلاع کے شاعروں کے تذکرے نہیں ملتے جس کی وجہ کچھ تو لاپرواہی اور کچھ دہلی اور لکھنؤ کے لوگوں کی عصبیت ہے۔ انھوں نے باہر والوں کی لسانی اور شعری حیثیت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ ''رعونت اور استثنا پذیری کا رویہ دہلی والوں نے تمام غیر دہلوی اردو ادب اور زبان کے لیے شروع ہی میں اختیار کر لیا۔''

''اہلِ لکھنؤ کی لسانی جغرافیائی تنگ نظری تو مشہور ہی ہے۔ آگے چل کر صاحب تصنیف نے کوئی تین درجن کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن میں دیارِ اعظم گڑھ کی دنیائے شعر و ادب کے تذکرے ہیں لیکن انھیں مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ یہی ان کی زیرِ نظر تصنیف کا موجب ہوا۔ لکھتے ہیں: ''اس لیے ایک ایسے تذکرے کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے یہاں کے شاعروں کے بارے میں کچھ بہتر معلومات فراہم ہو سکیں۔''

''یہ کتاب ہمارے ماضی وحال سے روشناس کرائے گی۔ اسلاف کی سرگرمیوں کی روداد سنائے گی اور گزشتہ نسلوں کے کارناموں پر غبارِ زمانہ کی جمی ہوئی تہوں کو صاف کر کے ہمیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنی روایتی اقدار کو سمجھنے اور جڑوں سے وابستہ رہنے کا حوصلہ دے گی...... اس تذکرہ کی ترتیب میں یہ سوچ بھی کارفرما ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے۔

حالات کی دست برد سے جو کچھ بچ گیا ہے اگر اب بھی ان کو محفوظ نہیں کیا گیا تو یہ سرمایہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' لکھتے ہیں کہ:

''اردو شاعروں کی چھ فائلیں تیار ہو چکی ہیں۔ یہ پہلی جلد سخنورانِ اعظم گڑھ کی پہلی فائل (الف) پر مشتمل ہے۔ اسباب و وسائل فراہم ہو گئے تو انشاء اللہ باقی جلدیں بھی اردو دنیا کی نذر کی جائیں گی۔ بعد میں عربی اور فارسی کے اعظمی شاعروں کے الگ الگ تذکرے شائع کیے جائیں گے...... موجودہ سلسلۂ تحقیق میں اس پر بھی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیہاتوں اور قصبوں کا ادب بھی زیر بحث آئے اور وہاں کی اصناف کے شعری نمونے جس حال میں بھی رہ گئے ہیں انھیں محفوظ کر لیا جائے۔''

اعظم گڑھ کے تمدن کے تنوع اور رنگا رنگی کا تذکرہ ماقبل تاریخ حبشی باشندوں سے شروع کرتے ہیں اور ایشیائے کوچک سے آئے ہوئے آریوں اور مقامی تہذیب پر ان کے علم و دانش کے اثرات پھر بودھ اور جین مذاہب کے فکر و فلسفہ کی گہری چھاپ کے بیان کے بعد مسلمانوں کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''مسلمانوں کے ذریعہ جو تمدن پیدا ہوا اس میں عرب کلچر، ایرانی تہذیب، تورانی آداب و معاشرت، افغانی اور ترکستانی ثقافت، مغلوں کے تمدنی آثار اور ہندوستانی سنسکرتی کی آب و تاب اور رنگ و نور شامل ہیں۔...... خود مغلیہ تہذیب نے ہندوستان کے دیومالائی اثرات کو بڑی چاہت سے قبول کیا لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس تہذیب نے اسلامی تہذیب کی وسیع القلبی، احترامِ انسانیت اور مذہبی رواداری کی ایسی طرح نو ڈالی کہ معاشرتی زندگی اور حکومت و عوام کی خارجی سطح پر بامعنی ربط و تعلق کی وجہ سے پرامن شہری زندگی اور مشترک اقتدار پر مبنی مشترکہ کلچر وجود میں آیا۔''

''مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں اعظم گڑھ شہر کو اعظم خاں متوفی ۱۷۱۵ء ابن راجہ بکرماجیت ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں اپنے نام پر بسایا اور ان کے چھوٹے بھائی

راجہ عظمت خاں ابن بکر ماجیت نے حدود ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں اپنے نام سے منسوب عظمت گڑھ بستی آباد کی۔ ان دونوں معاصر بستیوں کے نواح میں پہلے ہی سے بہت سے گھرانے مختلف مقامات و دیار سے آ کر بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ یہاں اور اطراف کی بستیوں میں صوفیائے کرام اور علمائے فحول کی آمد و رفت تیزی سے ہونے لگی۔ یہاں علم و دانش کے خیمہ بھی گڑتے گئے اور معرکوں میں سیف علم بھی بلند ہوتے رہے۔''

''اس دیار میں اسلام کی پو سپہ سالار مسعود غازی (۱۱ رجب ۴۰۵ھ/ ۱۵ فروری ۱۰۱۵ء-۱۴ رجب ۴۲۴ھ/ ۱۰ جولائی ۱۰۳۳ء) کی تبلیغی اور جہادی سرگرمیوں سے ہوئی۔''

اس کے بعد اس پورے خطے میں ان کی اور ان کے رفقاء کی جہادی مہموں کی تفصیلات ہیں۔ انہی کے دو رفقائے جہاد ملک طاہر اور ملک محمد قاسم ایک مہم کے دوران مئوناتھ بھنجن آئے، پھر لوگوں کے اصرار پر وہیں سکونت اختیار کی۔ ملک طاہر پورہ اور قاسم پورہ محلے انہی کے یاد دلاتے ہیں۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی ایک فہرست ہے جنھوں نے اس خطے میں تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں اور انہی کے نام سے اس علاقے کے کئی قصبات مثلاً محمد آباد گہنہ اور محی الدین پور وغیرہ کے نام منسوب ہیں۔

قصہ اردو زبان کا:

مختلف تاریخی اور تصنیفی حوالوں سے قمر الزماں مبارکپوری لکھتے ہیں کہ ''شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری دونوں افغان حکمراں تھے اور انھوں نے مختلف افغان قبائل کو شاہی مراعات دے رکھی تھیں۔ اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں بھی انھیں جاگیروں وغیرہ سے سرفراز کیا جاتا رہا...... انگریزوں کے دور میں انگریز خاندان بھی اس علاقے میں آئے اور یہیں کے ہو گئے۔ ۱۸۱۳ء میں آسٹریلین مشن نے اعظم گڑھ میں گریشن چرچ کی بنیاد ڈالی جو آزادی کے بعد عیسائیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حقیقتوں اور تاریخی شہادتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اعظم گڑھ اور اس کے

اطراف و دیار میں بہت پہلے سے مختلف النسل و مذاہب اور پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی ملی جلی معاشرت ہے۔ اسلام قبول کرنے والی قوموں میں بعض لوگ اور خاندان ایسے بھی تھے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے اونچے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگے۔''

''ان مخلوط معاشرتوں کی وجہ سے ہندوی جیسی ایک نئی زبان میں تبدیلی ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ اردو زبان کی پیدائش قوموں کی مخلوط معاشرت کا نتیجہ ہے۔ اردو کے آغاز کا سلسلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے جوڑنا تاریخی اور لسانی طور پر کسی طرح مناسب نہیں ہے کیونکہ اردو اس سے بہت پہلے وجود میں آچکی تھی اگرچہ اس کی شکل کچھ اور تھی اور مختلف لوگوں کی زبان و قلم پر اس کے نام بھی کئی ایک تھے...... گیارہویں صدی عیسوی میں جب مسلمان تواتر کے ساتھ ہندوستان میں سکونت گزیں ہوتے گئے تو اردو کی لسانی صورت گری پر نمایاں فرق پڑا لیکن یہ کہنا اور سمجھنا کہ مسلمانوں کے ساتھ میں آنے والی زبانوں عربی و فارسی، ترکی و پشتو اور مقامی زبانوں کے ملاپ سے اردو بنی ہے یا یہ ایک لشکری زبان ہے سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے جس کی تصدیق تاریخی حوالوں سے نہیں ہوتی۔''

''تاریخی شواہد اس نظریے کے حق میں ہیں کہ اردو مخلوط زبان نہیں، ہند آریائی زبان ہے اور اس کا جدید دور اپ بھرنشوں کا دور ہے اور اس کو وجود میں لانے والے عام ہندو ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کے نتیجے میں اردو کے وجود پذیر ہونے کے نظریے کے مقبول عام ہونے کا ایک بڑا سبب اس زبان کا نام اردو ہونا اور اس کا طرزِ تحریر فارسی خط بھی ہے۔ محققین کے حوالے اور علم لسانیات کی رو سے یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو قدیم ہندوستانی زبان ہے لیکن اس کا نام نیا ہے۔ بعض تاریخی کتابوں، تذکروں، صوفیوں کے ملفوظات وغیرہ میں ایسے کئی الفاظ و مرکبات اور جملے اور مصرعے آئے ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اردو ترکوں اور منگولوں کے زمانہ اقتدار سے پہلے ہی عوام میں رائج ہو چکی تھی۔''

’’بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مطابق مسلمان برصغیر میں اردو زبان نہیں لے کر آئے تھے۔ وہ عربی، فارسی، ترکی اور پشتو وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ وہ افراد جنھوں نے اردو کی تخلیق یا بنیاد رکھی وہ ہندو تھے۔ کیونکہ اردو اپنی نحوی ساخت اور شکلی اسٹرکچر کے مطابق ہندی جیسی ہے ۹۹ فیصد اردو فعل ایسے ہیں کہ جن کا تعلق ہندوستان سے ہے۔‘‘

’’اردو میں رائج چند جامد اسماء کو چھوڑ کر اس کے سارے صرفی ونحوی قواعد سراسر ہندوستانی زبانوں اور بولیوں سے ہی لیے گئے ہیں۔ زبان کی تین بنیادیں اسم، فعل حرف ہوتی ہیں۔ اسم کی بھی تین قسمیں مصدر، مشتق، جامد ہوتی ہیں۔ اردو کے افعال، مصدر، مشتقات اور حروف سارے کے سارے ہندوستانی ہیں اور اسم جامد کا غالب حصہ بھی ہندوستان کی تیرہ زبانوں سے اخذ کردہ ہے۔ صرف چند جامد اسماء عربی، فارسی، ترکی، انگریزی سے ماخوذ ہیں ...... اس کے تمام مصدر، افعال، صیغے، ضمیریں، علامات، زمانہ، حالتِ فاعلیت ومفعولیت کی علامتیں، حروف عطف واضافت اور دوسرے تمام حروف یہیں کی بولیوں کے ہیں .... اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اردو ہندوستانی سماج اور قدیم سنسکرتی کی دین ہے۔‘‘

’’اردو کے مولد و ماخذ اور آغاز وارتقا کے سلسلے میں ماہرین کے مختلف اقوال و نظریات ہیں مثلاً (۱) اس کی ابتدا سندھ سے ہوئی (۲) پنجاب اس کی زاد بوم ہے (۳) سرزمین دکن اس کی مادرِ وطن ہے (۴) دہلی اور اس کے نواح میرٹھ میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔‘‘ ...... ’’مگر ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنی حالیہ تحقیقی کتاب تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول مطبوعہ دہلی ۲۰۱۲ء میں اردو کے مولد ومنبع اور اس کے ماخذ کے تعلق سے بالکل نیا مگر براہین ودلائل سے مزین نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو کا ماخذ اودھی زبان اور اس کا مولد ومنشا خطۂ اودھ ہے۔ اس سے پہلے اپنی شائع کردہ تحقیق تاریخ اقلیم ادب حصہ اول میں بھی انھوں نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی جو مختصر تھی لیکن اب حالیہ تحقیق زیادہ

شرح و بسط اور نئی تفصیلات و معلومات پر مشتمل ہے۔''

گنگ و جمن کے دوآبہ کو ہندوستان کی تاریخ و تمدن اور صحیفۂ مذہب و اخلاق میں زمانۂ قدیم سے اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ فرشتہ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اودھ پہلا شہر ہے جو ملک ہندوستان میں آباد ہوا۔...... قدیم تاریخوں میں ہندوستان سے مراد وہی علاقہ تھا جو دہلی کے مشرق میں واقع تھا...... ہندوؤں کے عام عقیدے کے مطابق بھی ہندوستان سے مراد وہی علاقہ تھا جہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی اور گنگا بہتی تھی۔ برہمن بھی دوآبہ کو ہندوستان کہتے تھے اور یہیں رہتے تھے جہاں دوب گھاس اور کالے ہرن ہوتے ہیں، ...... اسی علاقے میں اجودھیا بھی ہے جس کے بانی ہندو عقیدے کے مطابق منورشی ہیں۔

''خطۂ اودھ کا یادو خاندان تیرہویں صدی عیسوی میں دکن کا حکمراں تھا، اس کا صدر مقام دیوگیر/ دیوگری (دولت آباد) تھا ...... (دکن کے سادھو سنت اور صوفی) اپنے معتقدات کو مزید جلا دینے کے لیے شمالی ہند تک کا سفر کرتے رہے ...... اس سیاحت کے دوران اپنی مقامی اور مادری زبانوں میں شمالی ہند کے اردو اثرات لے کر واپس جاتے تھے اور ان اثرات کو نئی پروان چڑھتی ہوئی زبان دکنی اردو میں ضم کرکے ایک نئے اسلوب زبان کی تشکیل کرتے تھے۔''

عبدالستار دلوی اور نصیرالدین ہاشمی کے حوالوں سے لکھتے ہیں:

''سندھ، دکن و پنجاب کے خارج ہوجانے کے بعد صرف دوآبہ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔''

آگے چل کر ان بزرگوں اور صوفیا کی تفصیلات ہیں جو شمالی ہند سے دکن میں وارد ہوئے اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''اس لیے تسلیم کیا جانا چاہیے کہ دکن پر مسلمانوں کے اقتدار سے پہلے ہی زبان پورب دکن میں پہنچ چکی تھی۔ اس پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ ملک پورب سے جو صوفیائے کرام دکن آئے، ان میں سے بعض کی عرفیت بھی ہندوی تھی۔ مثلاً

بدرالدین نولکھی......''

''چشتیہ مذہب کے صوفیائے کرام کی زندگی اور معمولات تصوف میں ہندوستانی قوم کی کشش کے بہت سے سامان تھے، راگ راگنیاں، وجد و حال سرود و سماع وغیرہ۔ ہندوستانی ان سے پہلے ہی سے واقف تھے اور پوجا پاٹ میں یہ طریقے رائج تھے۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے تبلیغ واصلاح اور تزکیہ نفس کے لیے جو مجاہدے کیے جو مراسم جاری کیے اور جوگیوں، بیراگیوں کے جو طریقے اپنائے ان کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ انھوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے اردو کی ابتدائی نشو ونما میں بھی اہم کردار ادا کیا۔''

''فیروز شاہ تغلق کو تخت و تاج دلانے میں مخدوم زادہ (حسن یوسف اسماعیل عباسی چریا کوٹی) کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا...... معاصر تاریخوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں پورب کے باسیوں کا اتنا سیاسی عمل دخل بڑھ چکا تھا کہ ان کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوگئی تھی۔ یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی زبان اودھی کو بھی عوام وخواص میں مقدس و موقر سمجھا گیا ہوگا۔''

''اودھی زبان میں چندرائن سب سے قدیم مثنوی ہے یہ مثنوی فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس میں چند، لورک اور منیا کی کہانی ہے۔ سارے شمالی ہند میں یہ لوک کتھا ''چندالور'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کہانی کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ ایک میں چندا ہیروئن ہے دوسری میں مینا۔ گولکنڈہ کے مشہور شاعر غواصی نے دکنی میں اس کہانی پر ''مینا ستونتی'' لکھی۔ اس سے پہلے دکن میں کوئی تحریری تخلیق نہیں ملتی۔ انہی کے قریب العہد دوسرے شاعر میاں سادھن نے اسی مضمون کی تکمیل کر کے اس کا نام ''میناست'' رکھا۔ یہ نظم بھی چندرائن کی طرح اودھ سے تعلق رکھتی ہے۔ میناست کے اثرات اپنے زمانے کی ادبیات پر بڑے گہرے اور وسیع دائرے تک قائم ہوئے۔''

''حضرت شیخ فتح اللہ انصاری اودھی متوفی ۲۶/ربیع الثانی ۸۲۱ھ ماہل ضلع اعظم گڑھ دہلی کے علمائے کبار اور مدرسین عظام میں تھے...... وہ سلطان تغلق کے دور میں دہلی میں آئے کچھ دنوں بعد جونپور پہنچے۔ یہاں ان کے ارشاد اور تلقین کا شہرہ عام ہوا۔ حاکمِ وقت (ابراہیم شاہ شرقی) نے پرگنہ ماہل میں چند مواضع بطور جاگیر دیے۔ قاضی اطہر مبارکپوری اور مولوی غلام سرور لاہوری کی تحریروں کے مطابق شیخ فتح اللہ اودھی دہلی میں اپنے ملک کی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی کے لوگ ان کے ملک (اودھ) کی زبان سنتے، سمجھتے، لکھتے اور بولتے تھے۔ اس کے بعد متعدد بزرگوں کے تذکرے ہیں جو مختلف ملکوں سے آکر مشرق میں مقیم ہوئے اور مقامی یعنی اودھی زبان میں تلقین و تبلیغ فرماتے رہے۔ بزرگانِ مشرق کی ایک طویل فہرست میں شیخ منجھن کا نام شامل ہے جن کا مزار موضع کمال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔ ان کی شہرہ آفاق مثنوی ''مدھومالتی'' کو اودھی زبان میں ادبی شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۵۴۵ء سے پہلے کا ہے۔ ایک اور بزرگ حضرت شاہ بدھن شطاری موضع املہ تحصیل گھوسی میں رہتے تھے۔ ان کے تعلقات گرونانک سے بہت مستحکم تھے۔ شاہ بدھن کے خلفاء میں اودھی زبان کے مشہور شاعر قطبن جونپوری مصنف ''مرگاوتی'' تھے۔ ان تذکروں کے بعد لکھتے ہیں ''شاہ بدھن کے تعلقات اور اس دیار پورب کی سکونت اور ان کے مریدوں کی اودھی شاعری اس قیاس کی تقویت کا باعث بن رہی ہے کہ انھوں نے بھی اظہارِ خیالات و وسیلہ جذبات کے طور سے اودھی کو جو اس خطے کی مقبول ترین زبان بن چکی تھی ضرور اختیار فرمایا ہوگا۔''

قمر الزماں مبارکپوری نے ان بزرگوں کی ایک طویل فہرست مع جملہ تفصیلات پیش کی ہے جو مشرقی بولی میں جسے وہ اودھی کہتے ہیں، تبلیغ و تدریس کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کی تصنیفات کے نام بھی درج کیے ہیں جن کی زبان اودھی ہے مثلاً تلسی داس کے معاصر شیخ عثمان کی منظوم عشقیہ داستان ''چتراولی''، ''اندرواتی''، ''انوراگ بانسری''، ''نل

دمن‘‘ کے مصنف وشاعر عربی و فارسی اور اودھی، تصوف وطریقت کے ماہر اور زندہ دل صوفی نور محمد کامیابؔ وغیرہ۔ آگے لکھتے ہیں ’’جو راگ ہندو مسلم میل سے پیدا ہوئے ان کو ریختہ کہا گیا اور ایک قسم کی شاعری بھی ریختہ تھی بعد میں چل کر یہ لفظ زبان اردو کے نام کے طور پر استعمال ہونے لگا۔‘‘

وہ مختلف حوالوں سے لکھتے ہیں کہ صوفیا کی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جہاں فارسی موسیقی، قول وترانہ کے دلدادہ تھے ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ اکبر کا بیٹا دانیال ہندی کا شاعر تھا، عبدالرحیم خان خاناں فن شعر میں رحیمن تھا۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ان تمام تفصیلات و حوالہ جات کے بعد قمرالزماں مبارکپوری حسب ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

’’یہاں تک کی بحث اودھی/ پوربی زبان وادب کے ارتقا اور ابتدائی نشو ونما سے تعلق رکھتی ہے جس سے ثابت ہے کہ اودھی زبان کا ادب ماضی میں بہت قابل قدر اور موضوعات ومضامین کے اعتبار سے بہت گرانمایہ ہے۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کہ اردو زبان موجودہ سنسکرت زدہ ہندی زبان سے قدیم ہے اور اس کا اپنا اسلوب ہے۔ ہندی والے انگریز حکمرانوں کی لسانی پالیسی کے زیر اثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو ہندی کی شیلی ہے۔ یہ تاریخی ولسانی اور تہذیبی وفکری بنیادوں پر نہایت لغو اور سراسر فرقہ پرستانہ جذبات ورجحانات پر مبنی خیال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ تمام تاریخی ولسانی حقائق وشواہد اس نظریے کی تائید میں ہیں کہ خود موجودہ ہندی اردو کی شیلی ہے، اور اسی نمونے پر نئی زبان کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔‘‘

انھوں نے اس نظریے کی تائید میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر ابو محمد سحر، آر ڈبلو فریزر، پروفیسر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر تارا چند کی تحریروں کے حوالے پیش کیے ہیں۔ موخرالذکر ایک مصنوعی زبان کو نئی اردو کہتے ہیں: ’’جس میں اردو فارسی کی

جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھ دیے گئے ہیں ایسا اس لیے کیا گیا کہ ہندوؤں کو ان کی اپنی ایک زبان مہیا کی جائے لیکن اس اقدام کے نتائج بہت دور تک گئے اور ہندوستان آج بھی اس مصنوعی تقسیم کے باعث دکھ اٹھا رہا ہے۔''

قمر الزماں مبارکپوری لکھتے ہیں:

''اس وقت اعظم گڑھ میں لکھنے پڑھنے اور بولنے کی زبان ہندی، اردو اور انگریزی ہے۔ انگریزی کا استعمال خال خال دفتروں اور سرکاری کام کاج میں ہوتا ہے۔ اردو کے شرفائے زبان عربی و فارسی کے الفاظ وتراکیب بہ کثرت استعمال کرتے ہیں اور ہندی کا دانشور طبقہ سنسکرت آمیز ہندی لکھتا اور بولتا ہے۔ عوام الناس آسان اردو یا عام فہم ہندی کا استعمال کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں بھوجپوری (پوربی) کا چلن عام ہے۔ عوامی بول چال میں علاقائی لہجے اور تلفظ کی جھلک شامل رہتی ہے۔''

آگے چل کر اس سلسلے میں مختلف بولیوں اور تلفظ کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے بہت ساری مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مزید لکھتے ہیں: ''اودھی اور بھوجپوری کے الفاظ اتنے گھلے ملے اور خلط ملط ہیں کہ یہ دونوں بولیاں ایک دوسرے کے مشابہ لگتی ہیں اسی لیے ماہرین ادبیات کے درمیان ان دونوں بولیوں کے علاقے کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔''

گیان چند لکھتے ہیں:

''تقریری روپ سے زیادہ کنارہ کشی اور لغت وقواعد کے زیادہ احترام کے باعث بعض اوقات زبانیں مر بھی جاتی ہیں ...... سنسکرت اور عبرانی اس کی مثالیں ہیں۔ بالکل یہی حال اودھی کا بھی ہوا، جو اپنے وقت کی ادبی اور معیاری زبان تھی۔ کم استعمال کی وجہ سے یہ قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔''

یہاں کی قومیں پہلے ہی سے رقص وسرود اور لوک گیتوں سے مانوس تھیں ......کوئی بھی موقع ہو کوئی بھی تقریب یا تفریحی مجلس ہر جگہ شاعری کا عمل دخل تھا (یہاں ہر طرح کے

بہتیرے مواقع کا نام بہ نام ذکر ہے مثلاً کھیتوں کھلیانوں میں طرح طرح کی الاپیں، میلے ٹھیلے میں اور مختلف پیشوں والوں کے گیت جیسے کہ دفالیوں، چرواہوں، گوالوں وغیرہ کے گیت، مزید براں ہر موقع کے گیت اور گانے جیسے کہ مذہبی مقامات پر، شادی بیاہ جیسی تقریبات کے موقع پر، فتوحات اور کامرانیوں کے موقع پر، اس کی ایک طویل فہرست ہے)۔

یہاں تہذیبوں کے اختلاف کے باوجود یکجہتی پیدا کرنے کی کوششوں کے ذیل میں بھکتی تحریک، تصوف اور روحانیت کے مظاہر، مزارات و مقابر وغیرہ کی تعمیر، ہر طبقہ اور ہر پیشہ سے متعلق لوگوں نے اچھی شاعری کی (یہاں نداف اور قوالوں سے لے کر حکماء تک کا تذکرہ ہے اس کے ساتھ ہی ہر طرح کی شاعری کا بھی ذکر ہے جس میں احتجاجی شاعری سے لے کر اصلاحی شاعری تک اور شاعری کی تمام اصناف مذکور ہیں۔ اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے کوئی ایک درجن سے زیادہ اساتذۂ سخن کے نام بہ نام تذکرے کے بعد لکھتے ہیں کہ)''یہ وہ چند نام ہیں جنھوں نے اعظم گڑھ کو دبستانی انداز اور رنگِ سخن عطا کیا، سید علی جواد زیدی نے دہلی اور لکھنؤ کے اسکول کو مفروضہ قرار دیا۔'' اور اپنے اس اعتراف کا اظہار کیا کہ ''اتر پردیش میں بیسویں صدی میں اگر اردو کا کوئی ادبی اسکول ہوسکتا ہے تو اسے علی گڑھ اسکول یا اعظم گڑھ اسکول کا نام دینا ہوگا۔''

اس خطے کی برادریوں میں لالہ برادری کا بطورِ خاص تذکرہ ہے۔ ''اکبر کے زمانے سے لالہ برادری کو زمینداری کے جملہ علوم وفنون میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ دفتروں، عدالتوں میں ان کا اچھا خاصا عمل دخل تھا۔ ان کا طرزِ معاشرت مسلمانوں سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ وضع داری، خوش پوشی اور خوش کلامی میں اس برادری کو درجہ تفوق حاصل تھا۔'' اس برادری کی شعری روایات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کو بیحد افسوس ہے کہ ان کے اخلاف نے ان کے شعری سرمایہ کو ضائع کردیا۔ ''صدرِ اجلاس کے ایک کاسٹنگ ووٹ سے ہاری ہوئی اردو کا اب یہ حال کردیا گیا ہے کہ اردو گھرانوں کی تین نسلیں لسانی حیثیت سے گونگی اور

بہری ہوگئی ہیں۔''

اعظم گڑھ اور اطراف کے قصبات میں شاعروں اور شعری نشستوں کے تذکرے ہیں۔ خود ہمارے موضع کوئریا پار میں گرمی کی چھٹیوں میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں شرکت کے لیے دوسرے قصبات سے بھی اقارب آیا کرتے تھے۔

ان تذکروں کے آخر میں قمر الزماں مبارکپوری خواتین کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ مشرقی تہذیب اور پردے کی پابندی کی وجہ سے شاعرات کا کلام منظرِ عام پر نہیں آسکا، تاہم انھوں نے چند شاعرات کے نام لکھے ہیں جو مختلف ناموں سے لکھتی تھیں۔ لکھتے ہیں: ''جن گھروں کی تہذیب زنان خانے میں نرگس کے پھول کا پودا لگانا بے حیائی جانتی ہو، شادی کے جوڑے جن قینچیوں اور سوئی دھاگے کی مدد سے تیار کیے جاتے تھے ان کو اور کپڑے کے کترن کو بھی مردوں کی نگاہ سے چھپایا جاتا ہو اس تہذیب کو کیسے یہ گوارا ہوتا کہ شاعرات کے اشعار دہلیز سے نکل کر نامحرموں کی محفل تک پہنچیں۔ کہتے ہیں ''اس بزم تذکرہ میں اگر شاعرات کی کم نمائندگی ہے تو مرتب سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔''

اس کتاب کی زبان اور اسلوب شروع سے آخر تک نہایت بلیغ ہے۔ معرب اور مفرس الفاظ کی کثرت نے تحریر کو کسی قدر پُر تکلف بنا دیا ہے۔ کسی ایک کتاب میں کثرت الفاظ کے معاملے میں تو شاید اس نے کوئی ریکارڈ قائم کیا ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس مضمون یا موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کی ساری جہات کا احاطہ کیا ہے، مثلاً شاعری کا تذکرہ ہے تو اصنافِ شاعری سے لے کر مشاعروں تک اور اعظم گڑھ کے علاوہ اطراف کے جن قصبات میں مشاعروں کا رواج رہا ہے ان کے نام تک شامل ہیں۔ گیتوں کا ذکر ہے تو کھیت کھلیان سے لے کر قوالیوں، شادیانوں اور تقریباً ہر موقع پر گائے جانے والے گیتوں کا ذکر ہے۔ اگر پیشوں کا بیان ہے تو زراعت سے لے کر پارچہ بافی، صناعی، ظروف گری، طبابت اور صحافت تک شاملِ فہرست ہیں۔ اسی طرح اقوام کے تذکرے نام بہ نام ہیں اور

اس علاقے میں بولی جانے والی بولیوں کے الفاظ اور ان کے مترادفات مذکور ہیں۔ ان صفات نے اس کتاب کے حدود اربعہ اور وسعتوں میں توقع سے بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ اولیاء، علماء، صوفیہ کی تو ایک طویل فہرست ان کی زمانی تاریخوں کے ساتھ موجود ہے۔ظاہر ہے اس تحریر میں طرح طرح کی بہت ساری تاریخیں درج کی گئی ہیں۔ مصنف نے ممکن حد تک ان کی تصدیق اور صحت کی کوشش کی ہے۔اس خصوصیت نے اس کتاب کو ایک قابل اعتماد حوالے کی کتاب بنا دیا ہے۔ غالباً اس تصنیف کی مہک ملنے والوں کو بھی اس نے متوجہ کیا اسی وجہ سے اشاعت کے بعد جلد ہی اس کی ساری جلدیں نکل گئیں۔ عین ممکن ہے کہ جلد ہی کم سے کم پہلی جلد کی اشاعت ثانی کی ضرورت بھی صاحبِ تصنیف کو محسوس ہو اس لیے لازم ہے کہ جن حضرات کے پاس مناسب مواد ہو اس سے مصنف کو مطلع فرمائیں جس کی انھوں نے درخواست کی ہے۔اس مضمون کے آخر میں ان سے رابطے کے لیے پتہ درج کیا گیا ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ یہ کونسل کا قابلِ تحسین کام ہے۔امید کرنی چاہیے کہ اس کتاب کی آئندہ اشاعتوں میں کونسل اپنا تعاون جاری رکھے گی۔

راقم الحروف کو یہ کتاب دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی جس کے کئی اسباب ہیں۔ایک تو یہی کہ اس میں ہمارے تین بزرگوں اور ایک ہم عصر کے اسمائے گرامی مع تذکرہ شامل ہیں۔ ایک ہمارے بڑے ابا حکیم مولوی محمد اصغر فاروقی صاحب جو شمس الرحمٰن فاروقی کے دادا ہیں۔ دوسرے مولوی حفیظ الرحمٰن ایمنؔ شہابی صاحب جو میرے ماموں جان ہیں جن کی شفقتوں کے سائے میں میری پرورش ہوئی، تیسرے انہی کے چچا مولوی احسن اللہ احسنؔ سمبھی جو رسالہ ’’زمانہ‘‘ کانپور کی ادارت میں شامل تھے اور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، چوتھے ہمارے برادرزاد پروفیسر اجلال احمد جو شبلی کالج اعظم گڑھ میں انگریزی کے استاد تھے۔

مزید براں اس کتاب میں میری تصنیف ’’ہمارے گاؤں ہمارے لوگ‘‘ کا بطورِ

حوالہ ذکر ہے اور کچھ اقتباس بھی ہے۔ اس کے علاوہ برادر محترم خلیل الرحمٰن فاروقی کی تصنیف ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' کا تذکرہ حوالوں میں شامل ہے۔ یہ دراصل ایک طرح کا خاندانی شجرہ ہے۔ انہی کے صاحبزادے شمس الرحمٰن فاروقی کی تصنیفات کے جابجا حوالے اور اقتباسات ہیں۔

ایک بات اور، میرے گاؤں کوئریا پار کے نام کی کئی توجیہات بیان کی گئی ہیں، لیکن قمرالزماں مبارکپوری نے ضلع اعظم گڑھ کے سات پرگنوں کے جو نام گنوائے ہیں ان میں سے ایک پرگنہ کا نام ''کوڑیا'' ہے۔ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اسی کی بگڑی ہوئی یا بدلتے بدلتے بدلی ہوئی شکل موجودہ ''کوئریا پار'' ہے۔ قمرالزماں مبارکپوری سے پہلے قاضی اطہر مبارکپوری اپنی تصنیف ''علمائے اعظم گڑھ'' میں ہمارے سات بزرگ علماء کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ ان تحریروں اور تصنیفات کے لیے راقم الحروف ذاتی طور پر ان دونوں بزرگوں کا بے حد شکر گزار ہے۔

◈◈◈

صدیقی سسٹرس کی کہانیاں اور پس منظر

دختران عزیز سیما سلمہا، نائلہ سلمہا، بینا سلمہا اور گل سلمہا نے وہ ہجرت نہیں دیکھی جو طوفان نوح کی طرح ایک عظیم الشان اور مستحکم تہذیب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ ہجرتوں کی تاریخ ہے لیکن تقریباً ساری ہجرتیں مغرب سے مشرق کی جانب ہوئیں۔ پہاڑوں کے سینے شق کرتی ہوئی ہوئیں، امواج بحر بیکراں کے سینے چیرتی ہوئی ہوئیں، لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے یہ پہلی ہجرتِ معکوس تھی جو مشرق سے مغرب کی جانب ہوئی۔ سبزہ زاروں سے کوہساروں اور ریگ زاروں کی طرف ہوئی۔ بہرحال ان بیٹیوں نے عالم مہاجرت میں آنکھیں کھولیں، اپنے اسلاف (یعنی والدین کے بزرگوں) کو نہیں دیکھا، ان کے وطن کی روح افزا ہواؤں میں سانس نہیں لی، وہاں کی نرم مٹی کی سوندھی مہک سے مشام جاں کو معطر نہیں کیا، وہاں کی ہریالی سے آنکھوں کو نورانی نہیں بخشی، اسلاف کی میراث کو نہ ان کے والدین ساتھ لے گئے نہ اپنی بچیوں کے لیے چھوڑ گئے لیکن شرافت نفس، دینداری اور علم و دانش کی روایات اور ان کے مظاہر ان کی رگِ جاں اور روح و رواں میں سرایت تھے، ان بیٹیوں کی قلم و قرطاس سے ہم رشتگی اسی

میراثِ نہفتہ کا حصہ ہے۔ وہ سارے عناصر نئی مٹی اور نئی آب و ہوا میں پروان چڑھتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ''سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں''۔

چنانچہ ہماری بھانجیوں کی (یہ ہماری اہلیہ مرحومہ کی بھانجیاں ہیں) پانچ کتابیں موصول ہوئیں۔ان میں سے دو کتابیں سیما کی ہیں۔ان دونوں میں سے ایک کئی سال پہلے موصول ہوئی تھی لیکن اس وقت میری وہ اعصابی اور روحانی آزمائش شروع ہوچکی تھی جو چار پانچ سال تک جاری رہنے کے بعد چند ماہ گزرے کہ انجام کار کو پہنچی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے بعد میں تنہا اور ذہنی طور پر مجہول ہوکر رہ گیا۔ جب حواس کچھ درست ہونے لگے تو ان کتابوں کا بھی خیال آیا۔سوچا کہ کم سے کم ان کتابوں کی رسید تو لکھ دوں سو یہ تحریر اسی کوشش کا حصہ ہے۔

ان بیٹیوں کے نانا سید محبّ الحق محشؔر حسینی مرحوم کا تعلق ضلع بلیا (یوپی) کے موضع چندائر کے ایک ممتاز اور خوشحال زمیندار گھرانے سے تھا۔انھوں نے دینی علوم سے فراغت کے بعد خدمت خلق کے طور پر طبابت کو اختیار کیا جو ایک اچھی مصروفیت بھی تھی چنانچہ وہ اطراف و دیار میں حکیم جی کے طور پر مشہور تھے۔موروثی طور پر حاصل ہونے والی فراغ دستی اور خوشحالی نے انھیں کسبِ معاش کے لیے تگ و دو سے بے نیاز رکھا تھا۔ ساری علمیت کے باوجود لکھنا لکھانا ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔''ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ''۔ مبدائے فیض نے مولانا موصوف کو اس دولت سے خوب خوب نوازا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ادب کی تقریباً تمام اصناف میں جواہر پارے پیش کیے۔ دینی مضامین نظم و نثر دونوں ہی اصناف میں لکھتے رہے جو دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کے ''معارف'' جیسے جرائد میں شائع ہوتے تھے۔اس کے علاوہ دیگر سنجیدہ اور طنز ومزاح کے رنگ میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ مجھے اپنی ابتدائی زندگی میں موصوف کی تحریروں کے محض چند نمونے دیکھنے کو ملے کیونکہ ہمارے درمیان فصلِ زمانی اور فصلِ مکانی دونوں ہی حائل

تھے۔لیکن ان تحریروں سے ان کی ادبی کاوشوں کی وسعتوں کا اندازہ تو ہو ہی گیا۔موصوف کی عمر نے وفا نہ کی اور جواں عمری میں ہی آغازِ مہاجرت سے ٹھیک ایک سال پہلے داعی اجل کو لبیک کہا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے انھیں جون 1946ء میں اعظم گڑھ میں جہاں وہ زیرِ علاج تھے آخری بار دیکھا تھا۔ اگست میں ان کی وفات ہوئی۔ آں محترم میرے خسر بھی تھے۔

سیما کی پہلی کتاب ''جن جنجال میں'' 2015ء میں شائع ہوئی اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ نانا مرحوم (مولانا سید محبّ الحق محشرؔ حسینی) کے مضامین کا ایک مجلد مسودہ ان کے پاس ہے۔اس کو شائع کرنا چاہیے تھا۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ مرحوم کی تخلیقات کچھ نہ کچھ مختلف عزیزوں کے ساتھ چلی گئی ہوں گی حالانکہ وہ سب ایک افراتفری اور بے سروسامانی کی حالت میں گئے اور وہاں بھی ایک عرصہ تک اسی بے سروسامانی کی حالت میں گزارے۔ایسے میں غیر ضروری چیزوں کے بچے رہنے کا امکان کم ہی ہوا کرتا ہے۔تاہم قیاس ہے کہ شاید محبوب خزاںؔ اور ان کے بڑے بھائی محمد ایوب صدیقی مرحومین کی کتابوں وغیرہ میں مولانا مرحوم کا کچھ کلام بھی موجود ہو کیونکہ ان بھائیوں کو شعر و شاعری سے خاص شغف تھا۔محبوب خزاں معروف تنقید نگاروں میں سے تھے۔ان کا ایک مجموعہ کلام ''اکیلی بستیاں'' مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ان بھائیوں کی ہمشیرہ محترمہ صالحہ صدیقی ان بیٹیوں کی بڑی اماں ہیں ماشاء اللہ سنچری بنانے کی طرف گامزن ہیں۔ سنا ہے کچھ عرصہ ہوا ان کی غزلوں کا ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔

نورچشمیوں کی حسب ذیل کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں۔ سیما کی پہلی کتاب ''جن جنجال میں'' اس میں 16 کہانیاں ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ''گیدڑ بھبکیاں'' اس میں 18 کہانیاں ہیں۔ نائلہ کی کتاب ''پڑھیئے گر بیمار'' میں 17 کہانیاں ہیں۔ بینا کی کتاب ''خاطر داریاں'' میں 18 کہانیاں ہیں اور گل کی کتاب ''مجرم کے بال'' میں 22 کہانیاں

ہیں۔ یہ کل ملا کر 91 کہانیاں ہیں یعنی سنچری میں صرف نو کی کمی ہے۔ یہ چاروں قلم کار بہنیں صدیقی سسٹرس کہلاتی ہیں اور ایک عرصہ سے لکھتی اور چھپتی رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہوا کے دوش پر بھی سوار ہوتی رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتابیں ادب اطفال میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں بیشتر کہانیاں بچوں سے متعلق ہیں اور بڑوں سے متعلق بھی۔ بچوں کے پڑھنے کی ہیں اس سے زیادہ بڑوں کے پڑھنے کی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آج لوگوں کو بات کرنے اور بات سننے کی بھی فرصت نہیں ہے تو کتابیں کیا اور کب پڑھیں گے تاہم ہر موضوع پر دنیا بھر کی زبانوں میں پہلے سے زیادہ کتابیں لکھی جارہی ہیں اور میڈیا کے طوفان کے باوجود اخبارات پہلے سے زیادہ چھپ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کتابوں میں شامل کہانیوں میں سے بیشتر ہوا کے دوش پر سوار ہوکر نوائے سروش کی طرح بچوں اور بڑوں سب کے لیے فردوس گوش و ہوش بن چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ ان قلم کاروں کی دوہری فصل ہے۔

اب کچھ ان تحریروں کے بارے میں۔ ان کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق کچھ کہنا سعی لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ سب تو ان کو بطورِ میراثِ خفی حاصل تھا صرف ان کے نمو پذیر ہونے اور پردۂ غیب سے باہر آنے کی دیر تھی۔ یہ قلم کار جس تہذیب کی وارث ہیں اس کے سارے انتشار اور بکھراؤ کے باوجود اردو زبان کے طفیل اس کا تسلسل باقی ہے۔ ان کے حصے میں اتنی خوش قسمتی ضرور آئی کہ ان کا کنبہ ہر حال میں مجتمع رہا اور ان کے اجڑے ہوئے معاشرے کے بیشتر اعضاء قرب و جوار کی نئی بستیوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ چنانچہ معاشرتی سطح پر ہر طرح کا لین دین جاری رہا ان میں رسم و رواج، زبان کے محاورے اور روز مرہ بھی تھے، تجربات اور مشاہدات بھی، قصے کہانیاں بھی، یہ سب ان کہانیوں میں موجود نظر آتے ہیں اور وہ نئے اور پرانے معاشرے، ماضی و حال پر ایک بیش بہا کڑی ہیں جنھوں نے سابقہ روایتوں کو زندہ رکھا ہے۔

مثال کے طور پر یہاں ایک کہانی میں کسی کے سر پر سینگ نکلنے کا تذکرہ ہے۔ ہم نے بھی اپنے بچپن میں سنا تھا کہ کسی راجہ کے سر پر سینگ نکل آئے تھے۔ حجامت کے لیے بہت پریشان تھا بالآخر ایک حجام کو اس شرط کے ساتھ حجامت بنانے کا حکم دیا گیا کہ وہ کسی سے کہے گا نہیں۔ لیکن وہ بیچارہ بہت پریشان ہوا اس کا پیٹ پھولنے لگا تو اس نے ایک کنوئیں میں جھانک کر کہہ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جب بھی کوئی اس کنوئیں سے پانی نکالنے جاتا تو اس میں سے آواز آنے لگتی ''راجہ کے سر پر دو سینگ۔ کن نے کہا کن نے کہا بن حجام نے۔''

اسی طرح ایک آسیب زدہ گھر کی کہانی ہے۔ جب اس میں رہنے والا عاجز آ گیا تو اس نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ''جب سامان لاد کر جانے لگا تو ایک طوطا آ کر سامان کے اوپر بیٹھ گیا اور چہک چہک کر کہنے لگا :اب ہم نئے گھر میں جا رہے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ہر زندہ زبان اپنے دوران سفر میں ہر پڑاؤ پر کچھ لین دین کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے چنانچہ اس کا بنیادی ڈھانچہ برقرار رہتے ہوئے بھی اس میں علاقائی اور مقامی اجزاء شامل ہوتے جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے وقت اور زمانوں کے جو اثرات انسانی بود و باش اور ان کے طور طریقوں پر مرتب ہوتے ہیں اصناف ادب میں ان کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایسا ہونا ضروری بھی ہے ورنہ وہ ادب بے وقت ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ سب ان کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے جو اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ یہ ساری تحریریں وقت سے، زمین و زماں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ''تازہ واردان'' کو ماضی سے آشنا کرتی ہوئی بڑھتی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان کہانیوں میں یہ اقدار مشترک ہیں لیکن ہر قلم کار کا طرزِ نگارش اس کے مزاج اور زاویہ نگاہ کے مطابق مختلف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ان بہنوں کی تحریروں میں بھی وہ فرق نظر آتا ہے۔ کہیں سیدھا اور صاف بیانیہ ہے کہیں طنز و مزاح کے چھینٹے ہیں۔ یہ عناصر سیما کی تحریروں میں نسبتاً زیادہ ہیں، اس کے لیے سماج کے غائر اور

باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد اس کو ہضم کر کے اپنی زبان میں پیش کرنا ہوتا ہے یہیں تیرونشتر کی شدت کے ذریعہ یا تھپکیوں سے آگاہی دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہیں قلم کار کے مزاج، افتادِ طبع کا اندازہ اس کے الفاظ اور محاورات کے انتخاب سے کیا جاسکتا ہے۔

سیما کو اس فن میں کمال کا ملکہ حاصل ہے انھوں نے ہلکے پھلکے اشاروں میں اپنی بات کہہ دی ہے کہیں ان محاوروں سے بھی کام لیا ہے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے نئی بستیوں اور نئی نسلوں تک پہنچتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی ہلکی پھلکی چٹکیوں کا جو نشانہ ہوتا ہے اسے دانت کی اس ٹیس کا لطف آتا ہے جسے دبانے میں بھی مزہ آتا ہے۔

گل رعنا کی کہانیاں اپنی تینوں بہنوں کی اوریجنل کہانیوں سے مختلف ہیں۔ یہ انگریزی کہانیوں کا ترجمہ ہیں۔ ان کی کتاب میں شامل 22 کہانیوں کے لیے گل رعنا نے معلوم نہیں کتنی کہانیوں کو پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد اس انبوہ میں سے ان کہانیوں کا انتخاب کیا ہوگا۔ یہ تو اس پوری تصنیف کا پہلا اور کافی طویل مرحلہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد زیادہ مشکل مرحلہ ان کہانیوں کے ترجمہ کا آتا ہے۔ بات صرف ترجمہ کی نہیں ہے بلکہ یہ کہ اسے کس طرح کی زبان میں پیش کیا جائے جس سے ان کہانیوں کا مخاطب یا قاری مانوس ہو۔ یہ کام کتنا مشکل ہے اس کو تو لکھنے والے ہی جانتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات ضرور ہے کہ اب ہماری تہذیب میں بھی کم وبیش وہ شہریت آتی جارہی ہے جو عالم گیر ہے معاشرے میں زیرِ استعمال اور برتے جانے والے سامان تقریباً آفاقیت اختیار کر چکے ہیں عام لوگوں کی رہائشوں میں بھی یکسانیت آتی جارہی ہے اور اسی اعتبار سے معاشرت اور طرزِ حیات میں یکسانیت آتی جارہی ہے مثال کے طور پر بچوں کے اسکول وہاں کی نصابی تعلیم اور غیر نصابی معمولات مثلاً اسپورٹس اور پکنک وغیرہ میں بڑی یکسانیت ہے جس کی وجہ سے ان کے رویوں میں بھی بڑی مماثلت ہوتی جارہی ہے۔ گھروں میں بھی ٹی وی، فریج اور استعمال

کی دوسری چیزوں، لباس، پوشاکوں میں یکسانیت سے بڑھ کر عالمگیریت آتی جارہی ہے اس لیے ان انگریزی کہانیوں میں جن حالات کا اور جن چیزوں کا تذکرہ ہے وہ غیر انگریزی داں قاری کے لیے کچھ نامانوس نہیں ہوں گے۔

جہاں تک کہانیوں کے اصل تانے بانے کا تعلق ہے ظاہر ہے معاشروں کے مطابق ان میں فرق ضرور ہوگا۔ تاہم ایک دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ کہانیاں مشرق کی ہوں یا مغرب کی ان میں کہیں کہیں غیر مرعی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً جن بھوت وغیرہ کی کافرمائی یا رہائشوں کا آسیب زدہ ہونا۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے گھروں میں مٹی کے برتن ٹوٹتے پھوٹتے تھے اب چینی اور شیشے کے برتن ٹوٹتے ہیں۔ پہلے چھینکے پر رکھی ہوئی چیزیں بچے یا جن اڑا لیا کرتے تھے اب فریج میں سے کھانے پینے کی چیزیں غائب ہوتی ہوں گی۔

بینا اور نائلہ کی کہانیوں میں آئے دن گھروں میں ہونے والے واقعات اور چھوٹے بڑے بچوں کے درمیان ہونے والے ہڑبونگ اور چھین جھپٹ کی بازدید یا بازخوانی کا لطف آتا ہے، ہر کسی کو اپنے گھر کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ رہی آسیبی عناصر کی کارفرمائی تو ہمارے یہاں پرانے مکانوں میں اس طرح کے قصے سنے جاتے تھے معلوم نہیں نئے سماج اور نئی بستیوں میں ایسے مکانات ہیں یا نہیں۔ ان کہانیوں سے تو ان کے ہونے کا اندازہ ملتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پلاٹ ۳۵-۴۰ برس خالی رہنے اور کئی ہاتھوں فروخت ہونے کے بعد اب اس پر ایک کئی منزلہ عمارت تعمیر ہوئی ہے لیکن ابھی اس میں کوئی رہنے والا نہیں آیا ہے۔ ذرا آگے اسی طرح کا ایک پلاٹ عرصہ تک خالی رہا اس کے بعد اس پر ایک مکان کی تعمیر ہوئی وہ بھی اب تک خالی ہے کئی ہاتھ بک چکا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

ان دونوں بہنوں کی کہانیوں میں ایک طرح کی مماثلت یا یکسانیت ہے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ وہی گھریلو پن، بچوں کی شرارتیں اور حکایتیں اور غیر مرعی عناصر کی

کارفرمائیاں بھی جو تقریباً ہر کتاب میں نظر آتی ہیں۔ شاید کچھ چٹخارے کے لیے ایسا ضروری خیال کیا جاتا ہو۔ بینا کی کہانی ''الف کی طرح سیدھی اردو' رہِ عام سے ذرا ہٹ کر ہے۔ اسکول اور پکنک والی لائن میں ہے۔ پڑوسیوں اور مہمانوں کے بھی اچھے خاصے تذکرے ہیں۔ ان کی عنایتوں اور تشریف فرمائیوں کے قلیل المدت اور طویل المدت، انفرادی اور تکثیری ہر طرح کے نوع بہ نوع تجربے ہمیں اور گھر بھر کو اچھے خاصے ہیں دہلی میں رہنے کے یہ ضمنی فائدے ہیں۔ ان بیٹیوں کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ اپنی بات یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

(رضوان اللہ)

◈◈◈

یادوں کا سفر

مصنف	:	عقیل احمد خاں
مرتبین	:	محمد مطہرین انجم فرخ آبادی/ اکمل ادیب کانپور
ناشر	:	آل انڈیا پونم کلچرل سوسائٹی، کانپور

عقیل احمد خاں کی خودنوشت سوانح حیات ''یادوں کا سفر'' زندگی کے تلخ و شیریں تجربات سے بھر پور ایک الف لیلوی داستان ہے جو سرزمینِ ہند سے شروع ہوتی ہے اور کتنے ہی ہفت خوانوں سے گزرتی ہوئی، کبھی عالمِ اسلام کی سیر کراتی، کبھی پرستانوں کے مناظر سے روح کو تازگی عطا کرتی ایک کامیاب زندگی کی کامرانیوں سے سرشار مغربی دنیا کی برکتوں کے بیچ لندن میں ٹھہر جاتی ہے۔

یہ تصنیف ملک کی آزادی اور تقسیمِ وطن کے طوفان میں شمالی ہند کے بااثر اور مقتدر مسلم طبقہ اشراف کے تار و پود بکھر جانے کی داستان ہے۔ اس دیارِ پاک کے تفصیلی تذکروں سے آنکھوں کو منور کرتی ہے جس کی گرد بھی خاکِ شفا ہے، کبھی ہسپانیہ اور سلطنتِ عثمانیہ کی بربادیوں کے آثار اور باقیات کے مناظر دکھا کر آنکھوں کو نم آلود کرتی ہے، کبھی اس جہان کی سیر سے جذبات کو مہمیز کرتی ہے جہاں قدرت کی حسن کاریاں بے حساب و بے قیاس ہیں۔

کبھی مشرق و مغرب کے لذائذ کے چٹخاروں سے کام و دہن کو پانی پانی کیا، کبھی پرانے سبق دہرائے اور تاریخی صداقتوں کی توثیق کی، کبھی ماضی کی سیر میں گم کردیا، کبھی حال میں واپس لاکر بے حال کردیا۔ ایک ایسی تلاطم خیز کتاب جو ہر آن مدوجزر سے دوچار رکھتی ہے۔

عقیل احمد خاں کی اس تصنیف میں صاف اور سیدھا اسلوب انگریزی ادب کے مطالعہ اس کی تدریس اور انگریز مصنفین اور دانشوروں سے ان کے ارتباط کا حاصل ہے۔ اردو زبان کی روانی، ربط و تسلسل کا جہاں تک تعلق ہے وہ قدرتِ کلام، تجربات و مشاہدات کی کثرت اور کہیں کہیں عربی اثرات کی جھلک عملی زندگی کے ایک بڑے حصے میں عالم عرب میں قیام، وہاں معلّمی اور سیاحت اور رشتۂ ازدواج کی وجہ سے ہونا بالکل فطری بات ہے۔ یہ تصنیف کانپور میں مصنف کے مخلص دوستوں کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ ان کی مدحیہ نظمیں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اتنی اعلیٰ درجے کی کتاب میں کہیں کہیں پروف کی غلطی حلوے میں ریت کی طرح کرکراتی ہے۔ لفظ ''الٰہی'' کا استعمال متعدد بار ہوا ہے، لیکن صرف دو جگہ اسے ''الٰہی'' لکھا گیا ہے، بقیہ ہر جگہ ''الاھی'' لکھا گیا ہے۔ اس کی صحت تحقیق طلب ہے۔

اس یک بابی کتاب میں مضامین کے ۴۲ موضوعات ہیں جن میں سے بیشتر بذات خود ایک باب کی حیثیت رکھتے ہیں اور کئی مضامین ایک ایک کتاب کے متقاضی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے مصنف کی زندگی کی جھلکیوں پر ایک نظر مناسب معلوم ہوتی ہے۔

''میرا بچپن عجیب و غریب حالات میں گزرا۔ مستقل نقل مکانی کے باعث کسی ایک جگہ ہمارا قیام نہ ہوسکا۔ کبھی فرخ آباد کے مختلف محلوں میں کرائے کے مکانوں میں، کبھی دریائے گنگا کی دوسری جانب محی الدین پور گاؤں میں اپنی زمینداریوں پر، کبھی کانپور کے مختلف محلوں میں، کبھی اناؤ میں اپنے نانا کے مکان پر۔'' تعلیم کانپور میں میموریل اسکول، حلیم مسلم کالج سے ہوتی ہوئی کرائسٹ کالج میں مکمل ہوئی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں والد کا انتقال ہوا...... ہم ماں بیٹے کی دنیا اندھیری ہوگئی۔ گھر کے برتنوں کو بیچ کر والدہ نے میرے حوالے

کچھ رقم کی تا کہ کتابوں وغیرہ کے کام آسکے...... پیغام اخبار (کانپور) میں ذمہ داریاں سنبھائیں...... سیفیہ کالج، بھوپال میں نوکری کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں سے خط وکتابت کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء میں انگلینڈ کی وزارتِ تعلیم سے مدرسی کا سرٹیفکٹ آ گیا۔ پانچ سال بھوپال میں انگلش ٹیچر رہنے کے بعد عازم لندن ہوا۔ پانچ ہزار روپئے جمع کیے تھے۔ ڈیڑھ ہزار کا بحری ٹکٹ خریدا۔ باقی رقم ماں کی تحویل میں چھوڑ دی۔‘‘ ایک اچھی ملازمت سے دست بردار ہوکر ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہونا کسی بھی معقول شخص کے لیے حماقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔‘‘

بمبئی سے روانگی کے بعد عدن، سوئز، پورٹ سعید اٹلی کے جزیرہ سسلی (صقلیہ)، نیپلز، جینوا اس کے بعد بذریعہ ٹرین لندن کے لیے براہ سوئٹزر لینڈ روانگی اور لندن میں ورود۔ ’’توکل کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہوگی کہ اجنبی شہرلندن میں پہلا دن اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ......ایک صاحب سے چھ پنس مستعار لے کر اپنے چہیتے دوست شبلی (مرحوم) کوفون کیا کہ ہم لندن پہنچ گئے ہیں۔‘‘ ...... ’’پھر مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، ریاض سعودی عرب میں تدریسی خدمات انجام دیں اور تقریباً ربع صدی گزارنے کے بعدلندن میں مستقل سکونت معہ اہل وعیال اختیار کی۔‘‘ ’’اوائل عمری میں لکڑی کے کھڑاؤں پہن کر گاؤں سے اسکول جاتا تھا اور پیروں کے دونوں گٹے کھڑاؤں کی چوٹوں سے لہولہان ہوجاتے تھے اب انہی پیروں کو میرے معبود نے انگلینڈ کے بنے ہوئے سو سو پونڈ والے کلارک کے جوتے عطا فرمائے ہیں۔‘‘ لیکن اس سے پہلے اپنی بیوہ ماں کو بلاکر عالم عرب کے علاوہ یورپ میں اسپین، اٹلی، سوئٹزر لینڈ، فرانس اور جرمنی کی خوب سیر کرائی عالی شان ہوٹلوں میں قیام کیا اور دمشق کے ایک معزز گھرانے کی چشم و چراغ ایک پری زاد کو شریکِ حیات اور ہمدم و دمساز بنایا۔

بیشمار معلومات اور عملی تجربات و مشاہدات سے لبریز یہ کتاب ان تمام لوگوں کے

لیے رہنمائی کا سامان رکھتی ہے جو عالم اسلام میں روحانی مسرتوں یا دنیاوی دولت و برکت کے طلبگار رہوں یا جو مغربی ملکوں میں قسمت آزمائی کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ اتنی بیش بہا کتاب کی قیمت کو برائے نام ہی کہا جاسکتا ہے۔ کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اہلِ مدینہ منورہ کے اخلاق، محبت اور غریب پروری کا آج بھی وہی عالم ہے جو حضورؐ کے زمانے میں تھا۔''

''پودینہ کی جتنی قسمیں میں نے مدینہ منور میں دیکھیں وہ دنیا کے کسی حصے میں نہ ہوں گی۔ تقریباً دو درجن تو ہوں گی...... سعودی عرب میں تقریباً چار سو قسم کی کھجوریں نخلستانوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔''

''دنیا کے چند عظیم ماہرینِ لسانیات میں ڈیوڈ میتھوز صاحب کا بھی شمار کیا جائے گا۔ کوئن ایلزابتھ کالج یونیورسٹی آف لندن میں انگریزی لسانیات اور صوتیات کے ٹیچر تھے۔ فرانس، جرمنی، اٹلی، اسپین، ترکی، مشرقی افریقہ، سیلون اور چند دیگر ممالک کے طالب علموں سے بڑی بے تکلفی سے ان کی اپنی زبانوں میں گفتگو کرتے تھے اور اردو زبان کی سب سے زیادہ خدمت کی۔''

''ایک اور انگریز ماہر لسانیات سر رچرڈ برٹن نے درجنوں یوروپین زبانوں کے علاوہ ۲۵ سے زیادہ مشرقی زبانیں سیکھیں قرآن شریف کے ۱۵ پارے حفظ کیے، ختنہ کروایا، مشرف بہ اسلام ہوئے۔ گوالیار میں قیام کے دوران بندروں کا مشاہدہ کیا اور ان کی تقریباً ستر آوازوں کی ایک ڈکشنری مرتب کی، ہر آواز کی شرح لکھی کہ ان کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

یہ کیسا حسنِ اتفاق ہے کہ ڈیوڈ میتھوز صاحب نے سی شیکل کے ساتھ اردو غزلوں کے ایک انتخاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، اس کتاب کا نام تھا An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ۱۹۷۲ء میں شائع کی تھی۔ اس کتاب پر میں نے تبصرہ لکھا تھا جو اخبار ''آزادِ ہند'' کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔

آج میتھوز صاحب کے لائق شاگرد کی کتاب پر تبصرہ لکھنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ مزید یہ کہ اس تصنیف کا ابتدائی ایک تہائی حصہ یعنی کرائسٹ کالج میں تعلیم اور مفلوک الحالی کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری ہی کہانی ہے جو پانچ چھ سال کے وقفے سے اسی شہر میں دہرائی گئی۔ بہر حال مزید اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''دمشق میں جامعہ اموی کی تاریخی مسجد کی زیارت کی جہاں پیغمبر زکریا علیہ السلام کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ حضرت امام حسین کا سرِ مبارک جہاں دفن ہے وہاں فاتحہ پڑھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار پر فاتحہ پڑھی، ان کے مربی سلطان نورالدین زنگی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔'' (اس فہرست میں کئی صحابہ، خلفا اور بزرگوں کے نام شامل ہیں۔)

''ترکی کے آخری خلیفہ عبدالحمید خاں سوئم ۱۹۰۹ء میں معزولی کے بعد مع اہل و عیال پیرس میں قیام پذیر ہوئے ...... حیدرآباد کے نظام میر عثمان علی خاں کا محل حیدرآباد ہاؤس کے نام سے لندن میں تھا، جہاں ان کے اہلِ خانہ کا اکثر قیام رہتا...... مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی وساطت سے ان دونوں گھرانوں کا تعارف ہوا۔ سلطان کی دو بیٹیوں کی شادی والیِ دکن کے دو صاحبزادوں سے ہوئی۔''

''کلاسیکی فصیح عربی زبان کی قواعد بہت مشکل ہے، جس سے اہلِ عرب بہت خوف کھاتے ہیں۔ اسی وجہ سے عربی زبان کی تدریس کے لیے عراقی، مصری، شامی، سوڈانی مدرسین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اتفاق سے پاکستان اور ہند کے مدرسین بھی نظر آجاتے ہیں۔ میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران عربی پڑھانے والا ایک بھی سعودی ٹیچر نہیں دیکھا۔''

''اسلام کی بنیادی مساوات نماز اور اجتماعی کھانوں کے درمیان عرب ممالک اور خاص طور سے سعودی عرب میں نظر آتی ہے۔''

''قرآن پاک کا پہلا ترجمہ کرنے والے شیخ سعدی ہیں۔''

”بے پناہ تعصب کے باوجود صاف اور کھلے ذہنوں کے کچھ ہسپانوی مل جاتے ہیں جو برملا عربوں کی عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک ہسپانوی نزاد برازیلی شاعر نے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا تھا کہ عربوں نے اسپین کو کیا نہیں دیا، ثقافت، تمدن، زراعت، کان کنی، فنون لطیفہ، ادب، شاعری، موسیقی، طب، ہندسہ، نظامِ تعلیم، فنِ تعمیر، آب رسانی، امن و آشتی، عدل و انصاف و رواداری، اہل تمدن جن چیزوں پر فخر کرتے ہیں عربوں نے ہمیں وہ سب کچھ دیا۔“

اس کتاب میں یورپ اور ایشیا میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ آثار و باقیات کو ذاتی مشاہدوں کے حوالوں سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر دل ہل جاتا ہے اور صرف آنسو دلی کیفیات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کرنے والے قابلِ مبارکباد ہیں۔

(رضوان اللہ)

◈◈◈

تاریخ بنگالہ (بزبان فارسی)

مصنف : ابوالمعالی محمد عبدالرؤف المتخلص بہ وحیدؔ بنگالی

ترجمہ (بزبان اردو) : نشورؔ واحدی

سب سے پہلے اس تصنیف کے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں: ''یہاں کے قدیم باشندے ہندو مذہب کے پیرو نہ تھے بلکہ بنگال کے مغربی پہاڑی باشندوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے جو اپنے طرز معاشرت میں ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں......بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں برہمنوں کے داخلہ کے بعد بنگال میں ہندو مذہب کا آغاز ہوا جس طرح اسلام یہاں مسلمانوں کے داخلہ کے بعد پھیلنا شروع ہوا۔''

''آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ملک بنگال 'مگدھ' کی عظیم الشان سلطنت کا ایک جزو تھا...... (اس کے) زوال کے بعد بودھ قوم کے فرقہ 'پال' کی حکومت ہوئی...... (اس کے) زوال کے بعد قوم 'بیدھ' کے فرقہ 'سین' نے اپنی حکومت قائم کرلی...... ہندوؤں کا قول ہے کہ اس فرقہ کا سب سے پہلا بادشاہ 'آدسور' تھا، جو ۱۰۶۳ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا......اس نے والی قنوج کو خط لکھا اور چند صاحب علم برہمن طلب کئے۔ والیِ قنوج نے پانچ برہمن وہاں سے بھیجے اور یہ پانچوں برہمن اپنے ساتھ پانچ ملازم بھی

لائے۔ اس طرح بنگال کے تمام برہمن انہی قنوجی برہمنوں کی اولاد سے ہیں اور تمام کائستھ فرقہ انہی خدام کی نسل سے ہے...... ان برہمنوں کو بلانے کی ایک خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ریاست کے برہمن اپنے مذہبی عقائد سے ناواقف تھے اور اپنے دین و آئین سے بے بہرہ تھے۔"

"بنگالی زبان کے متعلق بھی کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا کہ اس سرزمین میں کب ظہور پذیر ہوئی۔ اس زبان میں کثرت سے ایسے الفاظ کلمات ملتے ہیں جن کو اصلاً نہ تو عربی اور فارسی سے تعلق ہے نہ سنسکرت سے اس لیے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ قدیم زمانے میں بنگالی ایک مستقل زبان تھی جسے وہاں کے پرانے باشندے بولتے تھے، بعد کو دوسری السنۂ ہند سے خلط ملط ہو کر مٹ گئی، یہاں تک کہ ان کے موجودہ حروف تہجی بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ناگری حروف تہجی کی شکل وصورت رکھتے ہیں۔"

مکمل کتاب ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کے ابتدائی ۲۷ صفحات میں چار مضامین نشؔور صاحب سے متعلق ہیں۔ ایک تو دیباچہ ہے اور دوسرا خاندانی حالات یا سوانحی خاکہ۔ یہ دونوں مضامین ان کے صاحبزادے نیاز واحدی نے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دو مضامین نشؔور صاحب کے طرز تحریر اور ترجمہ سے متعلق ہیں۔ ایک شجاعت علی سندیلوی کا اور دوسرا ڈاکٹر محمد ارشد خاں کا۔ ان مضامین کے علاوہ نشؔور صاحب کی چند غزلیں بھی انہی صفحات میں شامل ہیں۔ نشؔور صاحب نے یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں کیا تھا، جس کی اشاعت کی نوبت نصف صدی بعد آئی ہے۔

تصنیف یا ترجمہ میں مصنف کے پس منظر کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا کہ ان کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ایسا شخص جس کو کم سے کم دو زبانوں انگریزی اور فارسی میں مکمل دستگاہ حاصل تھی، بڑا لائق اور صاحبِ علم رہا ہوگا ممکن ہے ان کی اور بھی علمی خدمات ہوں، جن کی کوئی سن گن نہیں ملتی نہ معاشرے میں ان کے مقام ومنزلت

کا پتہ چلتا ہے۔ کلکتہ میں ابھی ڈاکٹر عبدالسبحان جیسی شخصیات موجود ہیں وہ اس باب میں کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ کلکتہ سے مرشدآباد اور ڈھاکہ تک اور لوگ بھی ہوسکتے ہیں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ ممکن ہے وحید بنگالی کی دیگر تصنیفات بھی ہوں۔

مصنف ابوالمعالی محمد عبدالرؤف المتخلص بہ وحید بنگالی نے ٹیپو سلطان شہید کے پوتے شہزادہ کیقباد کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں ''میں نے باوجود ہیچمدانی کے ان تمام تاریخی واقعات کو جو انگریزی کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ایک تالیف جامع اور مختصر کی صورت میں پیش کردیا ہے۔'' مآخذ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اصلاً تو حصہ تاریخ بنگال از جان سی۔ مارشمین ہے۔ اس کے علاوہ سولہ کتابیں اور ہیں جن سے مؤلف نے اس کتاب کی ترتیب واسناد میں مدد لی ہے۔ سب انگریزوں کی تصنیفات ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ ان حوالہ جات میں ''سیر المتاخرین'' اور ''تاریخ فرشتہ'' شامل تو ہیں لیکن ان کے بھی انگریزی تراجم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ گویا اس کتاب میں جو تاریخ بیان کی گئی ہے، وہ انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ کا چربہ ہے۔

صاحبِ تصنیف کے مطابق یہ کتاب ''عہد ہنود سے لے کر ولیم بنٹنک تک'' کے تاریخی واقعات کا احاطہ کرتی ہے، لیکن کتاب کا متن بنگال کے آخری خودمختار مسلم حکمراں سراج الدولہ سے پہلے تک کے زمانے کا حاطہ کرتا ہے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں نے جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) میں شکست دی جبکہ ولیم بنٹنک کا عہد ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء ہے۔ اس کا مطلب ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ مصنف نے جہاں تک لکھنے کا ارادہ کیا تھا نہ لکھ سکا اور تصنیف نامکمل رہ گئی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نشورؔ صاحب نے اردو میں جس قدر ترجمہ کیا تھا اس کی اشاعت ہوگئی گویا ترجمہ نامکمل رہا۔ اصل صورتِ حال کیا ہے نہیں معلوم۔ اس کتاب کا سالِ تصنیف ۱۸۷۷ء درج ہے۔ اب اگر ولیم بنٹنک کے زمانے سے شمار کیا جائے تو نصف صدی کے واقعات اور اگر عہدِ سراج الدولہ سے شمار کیا جائے تو کم وبیش

ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے واقعات شامل تصنیف نہیں ہیں، جبکہ سراج الدولہ کی شکست سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی شکست تک کوئی ایک صدی کا عرصہ شمالی ہند میں مسلم حکمرانوں کے عہد کے سنگین ترین تاریخی واقعات سے بھرا پڑا ہے۔

اب بعض دلچسپ انکشافات۔ مشہور بنگالی مصنف اور صحافی نراد چودھری نے اپنی عمر کے آخری ۳۰-۳۵ برس برطانیہ میں گزارے اور وہیں ایک سو ایک برس کی عمر میں وفات پائی۔ وفات سے ایک سال قبل سو برس کی عمر میں اپنی آخری کتاب تصنیف کی۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں کلکتہ کے ایک انگریزی روزنامہ ''ہندوستان اسٹینڈرڈ'' میں ان کا ایک مضمون تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بنگالی ہندو نہیں ہے۔ وہ بقیہ ہندوستان کے ہندوؤں سے مختلف ہے۔ اس کا خون اور جلد کا رنگ چینیوں کے مماثل ہے۔ اس کے مذہبی رسم و رواج اور کلچر سب ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ ان کے اس بیان کی تصدیق زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی کی گئی ہے جو انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے وہ کتابیں انگریزوں کے نظریہ کے مطابق لکھی گئی ہوں گی۔ نراد چودھری خود اپنی فکر اور رویے میں پکے بنگالی تھے تو بظاہر اتنے ہی پکے انگریز بھی تھے۔ مکمل انگریزی لباس پہنتے۔ انگریزوں کو برتر اور ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے، جس کا وہ بلا جھجک اظہار کرتے۔ قیاس غالب ہے کہ انھوں نے ان انگریزی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہوگا اور ان سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے جن کا زیرِ تبصرہ کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے۔

نراد چودھری نے خود نوشت سوانح حیات The Autobiography of An Unknown Indian میں لکھا ہے کہ دہلی کے بادشاہوں کی بنگال پر سال میں چھ مہینے حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ میگھنا اور برہمپتر دریاؤں میں باڑھ آتے ہی سارا بنگال اور آسام کٹ کر الگ ہوجاتا تھا۔ سیلاب اترنے کے بعد دہلی کے فرمانراؤں کو پھر فوجی اور انتظامی مہم شروع کرنی پڑتی، لیکن وہ لکھتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ ہوتا تھا، جب بنگال میں لڑکیاں اپنے میکے آیا کرتی

تھیں کیونکہ آمدورفت کے عام وسائل نہ ہونے کی وجہ سے سیلاب کے زمانے میں کشتیاں عام طور سے آسان وسیلہ سفر بن جاتی تھیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں بنگال کے حکمرانوں کی اس چپقلش کا ذکر دلچسپ ہے جو ایک طرف یوروپین اقوام پرتگالی، برطانی اور فرانسیسی طالع آزماؤں سے اور دوسری طرف دہلی کے حکمرانوں کے ساتھ جاری رہتی تھی۔ ترجمہ کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور بقول مصنف اس نے خود بھی اپنی فارسی تصنیف کی زبان سادہ اور عام فہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں مذکور خاص خاص تاریخی واقعات تو ہندوستان میں لکھی ہوئی تاریخ کی مستند کتابوں میں مل جاتے ہیں، لیکن اس کتاب کی افادیت اس میں درج تفصیلات کی وجہ سے ہے۔ اس کی یہی خوبی اسے لائبریریوں میں رکھے جانے کے قابل بناتی ہے تا کہ دلچسپی رکھنے والے تاریخ کے طلبہ اس سے استفادہ کرسکیں۔

(رضوان اللہ)

◈◈◈

یادداشت
NOTES

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

یادداشت
NOTES

....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....

یادداشت
NOTES

....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....
....

یادداشت
NOTES

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

TABSERAT-E-KUTUB

RIZWAN ULLAH

تصنیفات

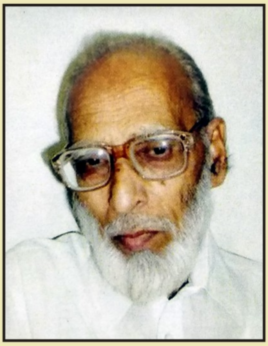

- اوراقِ ہستی
- شگوفے
- عکسِ خیال My Reflections
- ہمارے گاؤں ہمارے لوگ
- متاعِ سحر
- کلکتہ کی اردو صحافت اور میں
- اوراقِ مصور
- بے ادبیات

Translations from Urdu into English

1. What is Reba? ربا کیا ہے؟
2. Ups and Downs نشیب وفراز
   by Abul Fazl Farooqui
3. Maqbool's Dissertations مضامینِ مقبول
   by Prof. Maqbool Ahmed, FRCS
4. The Clarion Call صدائے جرس
   by Prof. Maqbool Ahmed, FRCS
   (Unpublished Manuscript)
   Translation from English into Urdu
5. Four Books of Computer Courses
6. Urdu Selftaught, Calcutta

اپلائڈ بُکس
APPLIED BOOKS
New Delhi-110002
Tel.: 011-23266347 Email: appliedbooks@gmail.com

ISBN 939057915-5
9789390579150